کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ واللہ مع الصابرین

ہندو مسلم اتحاد آزادئ ہند کا واحد علاج ہے

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

آزادی کی جنگ

(مصنفہ)

عبدالوحید خاں بی، اے (متوطن ضلع میرٹھ)
(مقیم حال) ۹ لاٹوش روڈ لکھنؤ

حسن پرنٹنگ پریس مرشدآباد پیلیس گولہ گنج لکھنؤ میں طبع ہوئی

سنہ ۱۹۳۶ء

پیش کش:۔ محمد احمد ترازی

انتساب

بکمال ادب

میں اس کتاب کو رئیس الاحرار حضرت مولانا محمد علی جو
کے نام سے منسوب کرتا ہوں آج ملک میں جو سیاسی اضطراب اور بیداری
ہے اور آزادی کی جتنی منزل بھی طے ہو چکی ہے وہ اسی مرد شہید
کے ایثار و قربانیوں کا نتیجہ ہے ۱۹۲۰ء کی تحریک "خلافت" مر
کی وہ واحد یادگار ہے جس کو آئندہ مورخ " آزادی ہن
کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھے گا۔ حقیقت یہ ہے
ہندوستان اور تمام عالم اسلامی مرحوم کی خدمات کو ک
فراموش نہیں کر سکتا میرے لئے یقیناً باعث فخر ہے کہ میں
ان تاثرات کو اس مایہ ناز ہستی سے وابستہ کر رہا ہوں

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
"کہ بر فتراک صاحب دولتے بستم سر خود را"

احقر

عبدالوحید خاں

سید ذاکر علی صاحب کے ہمت افزا ارشادات

مولوی عبدالوحید خان صاحب بی۔ اے۔ کی تصنیف کردہ کتاب
"آزادی کی جنگ" کو میں نے باوجود نہایت عدیم الفرصت ہوتے ہوئے
غور سے پڑھا۔ اس مختصر مگر جامع کتاب میں خاں صاحب نے جس خوبصورتی
کے ساتھ تمام سیاسی مسائل حاضرہ پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ یقیناً
قابل تعریف ہے۔ کانگریس کی موجودہ متکبرانہ پالیسی اور ہندو مہا سبھایانہ ذہنیت اور
مسلمانوں میں انتشار پھیلانے کی کوشش کی صحیح تصویر ان سے بہتر الفاظ میں نہیں کھینچی جا سکتی
نیز اس مختصر کتاب میں تمام موجودہ مسائل کو یکجا جمع کر کے جو نتائج مرتب کئے ہیں اور جس طرز سے
ان پر بحث کی ہے وہ مسلمان عوام کے لئے مشعل راہ ہیں۔

میں خاں صاحب موصوف سے عرصہ سے واقف ہوں ان کی سیاسی دلچسپیاں صحیح معلومات پر مبنی ہیں
ان کا مطالعہ وسیع اور طبیعت ذہین ہے۔ آپ ہمیشہ واقعات سے صحیح نتائج اخذ کرتے ہیں۔ تجارتی
اور تعلیمی مصروفیات کے باوجود سیاسیات کا مطالعہ کرنا اور تمام واقعات کو یکجا جمع کر کے نتائج مرتب کرنا اور
صرف کثیر سے ان کی اشاعت کرنا مسلم نوجوانوں کے لئے قابل تقلید مثال ہے اور قوم
کے لئے فال نیک ہے۔ مجھے امید ہے کہ مسلمانان ہند اس کتاب کی دوسری اشاعت کی قدر
کرینگے اور اس مختصر تاریخ کو گاؤں گاؤں پہنچانے کی کوشش کرینگے۔

سید ذاکر علی
سکریٹری مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ یو۔ پی لکھنؤ

محترم ایڈیٹر حق کا تبصرہ

آزادی کی جنگ

مسٹر عبدالوحید خاں بی اے نے "آزادی کی جنگ" کے نام سے ایک مختصر رسالہ تیار کیا ہے کہ جسے انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لکھنؤ کے موقع پر فروخت کرایا۔ اس رسالہ میں سیاسیات ملکی پر ایک نہایت مدلل و مکمل تبصرہ کیا گیا ہے۔ کہ جس میں برادران وطن کی تنگ فرقہ وارانہ ذہنیت کو اس خوبصورتی کے ساتھ بے نقاب کیا گیا ہے کہ اس کو دیکھنے کے بعد اس نام نہاد جنگ آزادی کی پوری حقیقت عیاں ہو جاتی ہے۔ مسلمانان ہند کی سیاسی پوزیشن ان کی اس کشمکش حیات میں دلچسپی اور شرکت سے اضطراب اور برادران وطن کو ان کی اپنی طاقت اپنے اثرات اور اپنی اکثریت کے زعم میں ان سے علیحدہ رکھنے کی پیہم و مسلسل کوششوں کو نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ منظر عام پر لایا گیا ہے۔ جمعیت العلماء کے اراکین خصوصی کی کانگریس سے ساز باز اور مسلم مفاد کو پامال کرنے کی مساعی کا بھی بالتفصیل تذکرہ بیان کیا گیا ہے ابتدا سے انتہا تک متانت و سنجیدگی کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا گیا ہے اور ہر چیز کو استدلال کی قوت سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مضمون کی دلچسپی شروع سے آخر تک یکساں زور قوت کے ساتھ قائم رکھنے کی فاضل مصنف نے نہایت کامیاب کوشش کی ہے وہ لوگ جو اصل واقعات سے ناواقفیت کے باعث اخبار اور مخالفین کے پروپیگنڈہ کا شکار ہو جایا کرتے ہیں۔ آج کل ایسے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہی نہیں ناگزیر ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بالکل بے لوث ہو کر لکھی گئی ہے۔ کہیں اشتعال زبان سے یا غیر ضروری جوش و خروش بلکہ اس کتاب کے ذریعہ سے ہر شخص کو غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔

ہم عبدالوحید خاں صاحب کو ان کی اس کامیاب کوشش پر تہہ دل سے مبارکباد دیتے ہوئے امید کرتے ہیں کہ ملک کے ناظرین کی طرف سے ان کی پوری حوصلہ افزائی کی جائے گی اور اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن اس سے زیادہ مقبولیت حاصل کرے گا جتنا پہلا کر چکا ہے۔

ملنے کا پتہ

قیمت ۸ر

عبدالوحید خاں صاحب بی۔ اے۔ منیجر الٰہی بخش شاہ ٹریڈنگ کو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ

دیباچہ

کچھ پہلو میں نہیں ہے اور سودائی تجلی ہو — کس قدر شوریدہ سر ہے شوق بے پروا ترا
سوچ تو دل میں لقب ساقی کا ہے زیبا تجھے — انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ بے صہبا ترا

کسی شہر میں جب آگ لگتی ہے اور طوفان آتش کے شعلے ہوا میں بلند ہونے لگتے ہیں تو ہر وہ شخص جو اس شہر سے وابستہ ہو خواہ وہ کتنا ہی دور ہو بے چین ہو جاتا ہے اور جوں جوں وہ آتشبار شعلے اس کے قریب آتے جاتے ہیں اس کی تشویش بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ جب وہ تباہ کن طوفان اس کے گھر کو گھیر لیتا ہے اور خود اس کے گھر کی دیواریں نذر آتش ہونے لگتی ہیں تو اس کی تشویش اور بے چینی کا کیا ٹھکانا ہے۔

۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد دو بڑے نتائج سامنے آئے۔ ایک طرف تو کانگریس کی زبردست ہندوؤں میں کامیابی اور چھ صوبوں میں اس کی اکثریت ہو جانے سے مسلمان مرعوب ہو گئے اور یہ سمجھ کر کہ اب حکومت کانگریس کے ہاتھ میں جا رہی ہے اس کے پیچ میں آ گئے۔ دوسری طرف کانگریس چونکہ تمام ہندوستان میں مسلمانوں میں بری طرح شکست کھا چکی تھی۔ غالباً تمام ملک میں سوائے ایک دو نشستوں کے مسلمان ایک بھی کانگریس ٹکٹ پر منتخب نہیں ہوا تھا اس سے کانگریس ہراساں ہو گئی۔ کیونکہ تمام دنیا پر ظاہر ہو گیا کہ کانگریس ہندو مہاسبھا کی دوسری تصویر ہے اس لئے اس کو تشویش لازمی تھی کہ جس طرح بھی ہو مسلم کیمپ کو توڑا جائے اور مسلمانوں کو آلہ کار بنا کر دنیا کو مظاہرہ کر دکھایا جائے کہ کانگریس میں چند مسلمان بھی ہیں۔

دونوں باتوں کا لازمی نتیجہ یہی ہوا کہ مسلمان کچھ تو مرعوب ہو کر اور کچھ کانگریس کا

آلہ کار بن کر اپنے کیمپ کو توڑنے اور کانگریس کے نوساختہ اور خوش نما قلعہ میں داخل ہونے میں مصروف ہو گئے۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ وہ تمام امیدیں جو مسلمانوں کی تنظیم اور قوت اتحاد کے متعلق الکشن کے زمانے میں وابستہ ہو گئی تھیں اور جن سے کانگریس اور حکومت دونوں ہمیشہ لرزہ بر اندام ہوتے ہیں ختم ہو گئیں اور اغیار کی اسکیم جو مسلم کیمپ میں انتشار پیدا کرنے کی تھی۔ پوری طرح کامیاب ہو گئی۔ یہ انتشار اور کانگریس کی رزم آرائیاں الیکشن کے فوراً بعد ہی شروع ہو گئی تھیں اور یہ طوفان آتش ملک کے ہر حصہ میں پھیل چکا تھا۔ جوں جوں یہ قریب ہوتا رہا۔ ہماری پریشانیاں بڑھتی رہیں یہاں تک کہ خود ہمارا مکان ان شعلوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔

۱۶ اگست کو میں نے حسرت و استعجاب کے ساتھ خود دیکھ لیا کہ یہ انتشار انگیز طوفان خود میرے مرز بوم میں داخل ہو چکا ہے اور وہی لوگ جو چار ماہ پیشتر مسلمانوں کو ایک رشتہ میں منسلک کرنے کے حلیف ہوئے تھے اپنی فوج کو ختم کر کے کانگریس کے قلعہ میں داخل ہو رہے ہیں۔

سنبھل ضلع میرٹھ میں افغانوں کا ایک خاص اور اہم قصبہ ہے وہی میرا زاد بوم ہے یہ چند اوراق پریشان وہیں کی مقامی حالت کو دیکھنے کا نتیجہ ہیں۔ ناظرین سے درخواست ہے کہ ان اوراق کا مطالعہ خالی الذہن ہو کر اور رواداری و حق جوئی کو ملحوظ رکھ کر فرماویں۔ اس کتاب کا واحد مقصد مسلمانوں میں باہمی اتحاد و تنظیم کی اہمیت پر زور دینا ہے اس لئے کہ میرا اعتقاد ہے کہ اگر ہندوستان کے مسلمان آپس کی رزم آرائیاں ختم کر کے متحد ہو جائیں تو ہندو مسلم اتحاد خود بخود ہو جائیگا۔ میں نے ہندو مسلم سوال کو فرقہ وارانہ حیثیت سے۔ حتی الامکان قطع نظر کیا ہے بلکہ ارباب کانگریس کی پالیسی پر اصولی بحث کی ہے۔ جسکا مقصد صرف یہ ہے کہ جو خلیج کانگریس کی ہندو بھائیانہ ذہنیت اور متکبرانہ طرز عمل سے اکثریت اور اقلیت کے درمیان حائل ہو گئی ہے اور جو آزادی ہند کیلئے سم قاتل ہے وہ دور ہو جائے۔ میرا اعتقاد ہے کہ ہندوستان کی آزادی ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ناممکن ہے۔ اور جس ہی اہم

ذہنیت کی ضرورت ہے اسکو پیدا کرنے میں کانگریس نے کوئی کوشش نہیں کی بلکہ اپنے تمام قوت مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے اور ان کو آئندہ انتخابات کیلئے آلہ کار بنانے میں صرف کر رکھی ہے۔

خدا کا شکر ہے اس کتاب کی پہلی اشاعت اسقدر مقبول ہوئی کہ پندرہ دن کے اندر تمام کاپیاں ختم ہو گئیں۔ غازی پور، میرپور، بنارس، گیا اور پنجاب، بہار اور یو۔ پی کے متعدد اضلاع سے برابر مانگ آ رہی ہے۔ اسلئے اس کو دوبارہ شائع کر کے ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں بیشتر حصے بالکل بدل دئے گئے ہیں اور اکثر مقامات پر کافی تفصیل کے ساتھ تاریخی حوالہ جات اور متعدد قراردادوں کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ جہاں آل انڈیا مسلم لیگ منعقدہ لکھنؤ کی بعض اہم تجاویز پر مختصر بحث آخر میں کی ہے۔ جملہ مسلمانان ہند بالخصوص ہر ضلع کی تمام مسلم لیگوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے حلقوں میں اس کتاب کے ذریعہ سے عوام کو موجودہ سیاسی حالات سے آگاہ کریں۔ اس کتاب کے نفع کی ایک ایک پائی شعبہ نشر و اشاعت مسلم لیگ اور مسلمانوں کی تنظیم کے لیے وقف ہو

آخر میں میں راغب حسین صاحب ایم۔ اے کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے خطبہ صدارت سے بعض تاریخی حوالوں کے معلوم کرنے میں بہت مدد لی۔

میں ان اخبارات اور اہل ذوق حضرات کا بھی بیحد مشکور ہوں جنہوں نے عدیم الفرصت ہونے کے باوجود اس کتاب کا مطالعہ فرما کر اپنے مفید ارشادات سے میری ہمت افزائی کی ہے ممنون ہونگا۔ اگر میں ان میں سے بعض حضرات کی ہمت افزا تحریریں ذیل میں نقل کروں۔

ایڈیٹر "الصدق" امروہہ

عزیز محترم۔ جس محنت اور قابلیت سے آپ نے موجودہ سیاسی رفتار اور مسلم لیگ و کانگریس کے حالات پر تبصرہ کیا ہے۔ اس کی داد نہ دینا بے حسی ہے آپ کی متانت اور انداز بحث قابل تعریف ہے۔ ہندو مسلمان کے باہمی تعلقات کی گذشتہ تاریخ اور کانگریس کی "مسلم نوازیوں" پر آپ نے نہایت ہی مدلل اور ناقابل تردید تبصرہ کیا ہے۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں

گردہ آپ جیسے قابل جوشیلے اور بیدار مغز نوجوانوں کو قوم کی ڈگمگاتی کشتی کے پار لگانے کے لیے عمر طویل اور آپ کے جذبۂ ملی میں ترقی عطا فرمائے۔

رئیس الاحرار حضرت مولانا حسرت موہانی صاحب دام ظلہ

آپ کی کتاب "آزادی کی جنگ" مجھے لکھنؤ سیشن میں ملی تھی۔ بہ مجبوری الیکشن کی وجہ سے پڑھنے کی فرصت نہ مل سکی۔ اب میں نے اس کو پڑھا تو دل نہایت خوش ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ نے کانگریس کی مکمل تصویر دنیا کے سامنے رکھ کر جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ حقائق کا سرچشمہ ہیں۔ جو حوالے اور واقعات آپ نے لکھے ہیں ان کی تردید نہیں کی جا سکتی۔ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں چھپوا کر اس طریقہ سے فروخت کرنا چاہئے کہ ہندوستان کے ہر مسلمان کے پاس پہنچ جائے۔ میری دعا ہے کہ اسلام اور ہندوستان کو آزاد کرنے میں آپ جیسے نوجوانوں کی جدوجہد کامیاب ہو۔

خواجہ غلام حیدر شاہ صاحب میونسپل کمشنر گونڈہ

مکرم بندہ زاد عنایتہ۔ آپکی تصنیف "آزادی کی جنگ" کے مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ سبحان اللہ! پڑھ کر بیحد خوشی ہوئی۔ واقعی آپ نے کس خوبصورتی کے ساتھ حقیقت کو بے نقاب کیا ہے۔ خداوند عالم آپ جیسے حضرات ہماری قوم میں ہزاروں پیدا کرے تو جو خرابیاں ہم میں موجود ہیں۔ ان کا کچھ علاج ہو سکے۔ موجودہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے آپ کی یہ کتاب ہر گھر میں ہونا چاہئے۔ اس قسم کی کتابیں ایک بہت بڑی اسلامی خدمت ہے۔ مجھ کو سب سے بڑی خوشی تو یہ ہے کہ آجکل بی۔ اے۔ کی ڈگری والوں میں آپ جیسے ہوشیار اور قوم کا سچا درد رکھنے والے موجود ہیں۔ خداوند کریم آپ کو برخوردار کرے اور قوم کے لیے آپ کو باعث فخر و ناز بنائے۔

سکریٹری مسلم لیگ بہٹا ضلع پٹنہ

محترم السلام علیکم۔ آپ کی تصنیف "آزادی کی جنگ" اتفاقیہ طور پر مجھے ملی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب آپ نے خواہ کسی خیال سے لکھی ہو نہایت ہی مفید اور کارآمد ہے۔ میرا خیال ہے آپ نے لیگ کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ بلکہ میں کہوں کہ سارے مسلمانوں کی خدمت انجام دی ہے تو زیادہ موزوں ہے۔

عبدالکریم صاحب غازی پور

جناب من۔ السلام علیکم آپ کی کتاب "آزادی کی جنگ" میں نے مسلم لیگ کے جلسہ میں خریدی تھی۔ یہاں گھر پڑھنے کے بعد بہت جی چاہ رہا ہے کہ یہ کتاب میں اپنے اور دوستوں کو ہدیہ دوں جو گمراہی کی طرف جا رہے ہیں۔

گذشتہ تاریخ کے چند اوراق

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

کانگریس کا موجودہ طرز عمل اور برادران وطن کی آجکل کی ڈپلومیسی کا صحیح انداز کرنے کے لیے اس چیز کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ ان کے سوشل طرز عمل پر نظر ڈالیں کہ وہ کیوں اپنے ہمسایوں سے طبعاً نفرت کرتے ہیں اور ایک ہزار برس کے باہم میل جول سے بھی ان کے دل سے یہ خیال دور نہیں ہوا کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کے لیے ہے بلکہ اس کا صحیح اندازہ گذشتہ تین صدیوں کی تاریخ کے مطالعہ سے ہوتا ہے

اکبر کو اس کے آخری عہد سلطنت میں ابوالفضل نے ایسی غلط پالیسی پر چلایا کہ وہی حکمت عملی سلطنت مغلیہ کو گھن کی طرح کھا گئی۔ ہندوؤں سے اتحاد اور ان کی مدد حاصل کرنا عین سیاسی مصلحت تھی۔ مگر اکبر نے سلطنت کا تمام کام ہندوؤں کے ہاتھوں میں سونپ دیدیا تھا کہ اورنگ زیب کے تخت نشین ہونے سے پیشتر ہی سے ہندوؤں نے یقین کر لیا تھا کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کے لیے ہے یہی وجہ تھی کہ جب اورنگ زیب نے ان کو بتلانا چاہا کہ ہندوستان میں مسلمان کا بھی وہی حق ہے جو ہندوؤں کا ہے تو اس کو جو خمیازہ اس کا

بھگتنا پڑا۔ اس کا شاہد تاریخ کا ہر صفحہ ہے۔ پنڈت مالویہ اور گاندھی جی کو لاکھ یقین دلایا جائے کہ اورنگ زیب کو اگر ہندوؤں کو مٹانا ہوتا تو آج دہلی کے اطراف میں صرف ہندوؤں کی بستیاں موجود نہ ہوتیں۔ مگر ہرگز ماننے کو تیار نہیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جس رواداری سے مسلمان بادشاہوں نے ہندوستان میں حکومت کی اسکی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ میں ذیل میں مسز سروجنی نائیڈو سابق صدر کانگریس کی تقریر کے چند اقتباسات درج کرتا ہوں جو موصوفہ نے حیدرآباد میں کی تھی اس سے مسلمانوں کی حالت کا کتنا پتہ چلتا ہے۔ "عربوں نے صرف ملک اور زمین فتح نہیں کیں بلکہ دل و دماغ فتح کئے ہیں۔ مسلمان بھائیو! ہمارے خیال و خواب (فلسفہ) کو حقیقت کا جامہ تمہیں نے پہنایا اور ہمارے افکار و تخیلات خالیہ میں حرکت اور جان تمہیں نے ڈالی۔ آپ جانتے ہیں کہ مسلمانوں نے دنیا میں علوم و فنون کی کیا خدمات جلیلہ کی ہیں۔ انھوں نے ہندوؤں کی طرح بخل روا نہیں رکھا"

(اخبار وکیل ۲۶ جنوری ۱۹۳۱ء)

اورنگ زیب کے زمانے میں ہندوستان کی صنعت و حرفت معراج ترقی پر پہنچ چکی تھی۔ جسطرح آج جاپان کی مصنوعات نے تمام دنیا کے بازاروں پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس زمانے میں ہندوستان کی مصنوعات کا یہی حال تھا۔ مسٹر ڈینیل ڈیفو نے ۱۷۰۸ء میں یعنی اورنگ زیب کی وفات کے ایک سال بعد اپنے ایک اخبار اس مفہوم کا ایک مضمون لکھا تھا کہ

"اہل انگلستان ہندوستان کے بنے ہوئے کپڑوں کی خواہش کرتے ہیں۔ ہندوستان کی چھینٹیں اور چھپے ہوئے کپڑے پہلے فرش وغیرہ بنوانے کے کام میں آتے تھے۔ مگر اب ہمارے ملک کی شریف زادیاں تک انھیں پہننے لگ گئی ہیں اور دوسروں کا تو ذکر کیا۔ خود انگلستان کی ملکہ بھی چاپانا سلک اور ہندوستان کی چھینٹیں پہننا پسند کرتی ہیں اس وقت چاروں طرف ہندوستانی کپڑا نظر آرہا ہے۔" (بھارت درشن ۔)

ہر زمانے میں تعلیم کی جو حالت تھی۔ خود مہاتما گاندھی کی اس تقریر سے معلوم کیجئے

جو انھوں نے ۱۹۳۱ء میں بنارس میں کی تھی۔

"برٹش گورنمنٹ کی آمد سے قبل ملک میں تیس ہزار مدرسے تھے۔ جن میں دو لاکھ طلبا تعلیم پاتے تھے۔ آج حکومت دفتری بمشکل تمام چھ ہزار مدرسوں کا حوالہ دے سکتی ہے۔"

(اخبار مسافر آگرہ ۲۰ دسمبر ۱۹۳۰ء صفحہ)

لیکن ان تمام واقعات اور مسلمانوں کی رواداری کے باوجود اورنگ زیب کے زمانہ حکومت اور اسکی وفات کے بعد برادران وطن نے تخت دہلی کے ساتھ جو بیوفائی کی وہ ایک عبرت انگیز افسانہ ہے۔ دکن کے برہمنوں نے برابر شیواجی اور دیگر مرہٹوں کو مسلمان بادشاہوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے ابھارا۔ شری سمرتھ رام داس سوامی برہمن نے بقول لالہ لاجپت رائے "شیواجی کو بار بار اسلام کے خلاف جنگ کرنے کا اپدیش کیا"۔ (شیواجی اردو صفحہ ۲۲۲)

شیواجی نے جو خط راجہ جے سنگھ کو لکھا تھا جب اورنگ زیب نے اسکو سیواجی کے خلاف جنگ کرنے بھیجا تھا وہ درس عبرت ہے۔

"میری تلوار مسلمانوں کے خون کی پیاسی ہے۔ افسوس صد ہزار افسوس کہ یہ تلوار مجھے ایک اور ہی اہم کیلئے میان سے نکالنی پڑی اسے مسلمانوں کے سروں پر بجلی بن کر گرنا چاہیے تھا۔ جن کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ جنھیں انصاف کرنا آتا ہے۔ میری بادلوں کی طرح گرجنے والی فوجیں مسلمانوں پر تلوار کا وہ خونی مینہ برسائینگی کہ دکن کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک سارے مسلمان اس سیلاب خون میں بہہ جائیں گے اور ایک مسلمان کا نشان بھی باقی نہ رہے گا۔" یہ کوئی فرضی خط نہیں ہے بلکہ اس خط کو نقل کرنے کے بعد مسٹر کے سوریہ وکیل شیواجی کی تعریف کرتے ہوئے خود رقمطراز ہیں "کہ سیواجی کے یہی الفاظ اپنے اصل رنگ میں ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اسلام کو مٹا کر اس ملک کا عام مذہب ہندو دھرم کو بنانا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کو حوالہ شمشیر و آتش کرکے ہندوستان سے ان کا نام و نشان مٹادے۔" (الجمعیۃ دہلی ۲ جون ۱۹۲۷ء)

سیواجی کی وفات کے بعد اسی برہمن نے سیواجی کے بیٹے سنبھاجی کو باین الفاظ تحریک کی "تم ایسی ہی سب ہندو (محبت سے رہو) اپنے مسلمان دشمنوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے راستہ سے ہٹا دو لوگوں کے دلوں میں ملیچھوں کا مقابلہ کرنے کا خیال پیدا کرو اور مہاراشٹر کی سلطنت کو سب بڑھانے کی کوشش کرو۔"

(تاریخ مہاراشٹر بھاگ پرمانند صفحہ ۳۳)

تاریخ کے ان اوراق کے اعادہ سے خدانخواستہ برادران وطن کے خلاف کوئی جذبۂ نفرت پیدا کرنا منظور نہیں ہے۔ بلکہ اس سے یہ دکھانا منظور ہے کہ ابھی دو سال ہوئے جب مہاراشٹر میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا تھا تو کانگریس نے انہیں "ہندو راج" قائم کرنے والے ہیرو کو پرستار بنایا تھا اور کانگریس دروازے تک کا نام "شیواجی گیٹ" رکھا تھا۔ کسی ہیرو کی پرستش کرنا اسکے اصول اور آئیڈیل کی تعریف کرنا ہے اسطرح کانگریس نے شیواجی کو ہیرو مان کر اسکے عملی ترین اصول "ہندو راج" کو سراہا ہے

ہندو راج کی حمایت جو شیواجی نے کی اسکی تعریف کرنا کانگریس کا پہلا ہی موقع نہ تھا اس سے پیشتر بڑے سے بڑے لیڈر نے شیواجی کے اس کام کو "قومی خدمت" سے تعبیر کیا ہے۔ پرمانند اور مالویہ کے اقوال کو نظر انداز کیجیے تلک آزادی ہند کے علمبرداروں اور کانگریس کے خداوندان قدیم میں سے شمار کیے جاتے ہیں مگر رولٹ کمیٹی کی رپورٹ پہلا باب صفحہ ۱۲ تا صفحہ ۱۵ " میں انجہانی تلک کے وہ ریمارک دیگر مقررین کی تقریروں کے ساتھ ملا کر پڑھیے جو انھوں نے ۱۲ جون ۱۸۹۷ء کو سیواجی کی تاجپوشی کی یادگار میں ایک جلسہ میں کیے تھے۔ ان کی پوری تقریر ۱۵ جون ۱۸۹۷ء کی اشاعت کیسری میں درج ہے جس کے ایڈیٹر خود تلک صاحب تھے ریمارک یہ ہے۔

"سوال یہ ہے کہ کیا شیواجی نے افضل خاں کو قتل کر دینے میں کوئی پاپ کیا تھا اس کا جواب مہابھارت کے اوراق ہی میں ملتا ہے۔ بھگوان کرشن کا صاف اپدیش ہے کہ نشکام کا کرم ہوتے ہوئے بیشک اپنے گرو اور رشتہ دار تک کو ہلاک

کر دو۔ تم پر کوئی الزام عائد نہ ہو سکے گا۔ افضل خاں کے قتل میں شیواجی کی ذاتی اغراض پوشیدہ نہ تھیں۔ اس نے جو کچھ کیا رفاہ عام کی خاطر کیا۔ اس سے اسکے قتل کو گناہ نہیں کہا جا سکتا۔

اگر ہمارے گھر میں چور داخل ہو جائیں اور ہم دیکھیں کہ ان کو باہر نکالنے کے لیے ہم میں کافی قوت نہیں ہے۔ تو چاہیے کہ ان کو اندر بند کر کے مکان کو آگ لگا دیں اور ان کو زندہ جلا دیں۔ پرماتما نے غیر ملکی لوگوں کو تانبے کے ٹکڑے پر لکھ نہیں دیا ہے کہ جاؤ ہندوستان کی حکومت تمہاری ہے۔"

بہر حال ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے جو کچھ دہلی کی سلطنت کے ساتھ ہندوؤں نے کیا وہ محض ایک عبرت انگیز افسانہ ہے۔ مرہٹوں کی تمام تر تقریبیں آخری وقت تک صرف اس کام میں صرف ہوتی رہیں کہ مسلمان ہندوستان کی سلطنت سے محروم ہو جائیں۔ ۱۷۹۲ء وہ بدقسمت سال ہے جب کہ مرہٹوں نے سرکار برطانیہ سے صرف اس لیے معاہدہ کیا کہ حیدر علی کے بہادر فرزند ٹیپو سلطان کی سلطنت کو برباد کر کے اس کو انگریزوں اور مرہٹوں میں تقسیم کر لیا جائے۔ حالانکہ اس کا خمیازہ بعد میں خود مرہٹوں کو بھگتنا پڑا۔ کارنوالس کی اس فتح نے بہر حال مسلمانوں کی اس آخری امید کو بھی توڑ دیا۔ جو ان کو اس کی ذات سے وابستہ ہو گئی تھیں۔ ہندو کسی حالت میں بھی اسلامی حکومت کو دیکھنا گوارا نہ کرتے تھے ہندوؤں کے لیے اس سے زیادہ خوشی اور کیا ہو سکتی تھی کہ ایک مسلمان کی سلطنت تباہ ہو کر ٹیپو کی شہادت کے بعد اس کے تخت کا جانشین سرکار برطانیہ نے ایک ہندو برہمن کو کیا۔

اس کے بعد ۱۸۵۷ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے تند جھونکوں نے سلطنت مغلیہ کے آخری ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو جس کی آخری جھلک بھی مسلمانان ہند کیلئے کچھ تسلی کا موجب تھی بجھا کر رنگون میں دفن کر دیا جہاں اپنے آخری تاجدار کی قبر پر امت فاتحہ بھی نہ پڑھ سکے (اس وقت کی تاریخ بھی برادران وطن کی بیوفائی سے خالی نہیں جب بہادر شاہ نے فوج کے اصرار سے مجبور ہو کر شہنشاہیت کا خاردار تاج منظور کر لیا تو ہندوؤں نے اس کو پھر ایک بار اسی موت خیال کیا کہ مسلمانوں کی سلطنت کا چراغ سحری پھر روشن ہوا جاتا ہے

تو انھوں نے فوراً ہی جھانسی اور ناگپور کے تخت پر مرہٹوں کو متمکن کرکے ہندو سلطنت قائم
کرنا چاہی نتیجہ جو ہونا تھا ہوا مگر ہندوؤں کی یہ آرزو پوری ہوگئی - کہ مسلمانوں کی سلطنت
کی آخری یادگار بھی برباد ہوگئی - اس لئے کہ ہندو کے نزدیک انگریزی حکومت خواہ
وہ کیسی ہی ظالم ہو مسلمانوں کی حکومت سے بہتر ہے -

غدر کے بعد سے مسلمانوں کی حالت انیسویں صدی کے آخر تک بہت ہی ابتر رہی
اس لئے کہ برطانیہ کی تمام کوشش مسلمانوں کی قوت سیاسی (جو اب محض تخیل
میں باقی رہ گئی تھی) کو ختم کرنے میں مصروف رہیں - ادھر برادران وطن نے اطمینان کا
سانس لیا کہ اب مسلمانوں کی حکومت کی کوئی جھلک باقی نہ رہی اس لئے ہندوؤں کی
تنظیم اور اصلاح میں مصروف ہو گئے -

غدر کے بعد

سر سید علیہ الرحمۃ نے جنھوں نے ابتدا میں مسلمانوں کو سیاست سے علیحدہ رہنے کی تلقین
کی تھی ۱۸۶۶ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی اور اگست ۱۸۸۸ء میں علیحدہ
یونائیٹڈ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن (مجلس محبان وطن) قائم کی اور فوج میں ہندوستانیوں
کو اعلیٰ مناصب پر تقرر کرنے کی حمایت کی حقیقت یہ ہے - کہ سر سید " وطن پرور
اور ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے - لیکن برادران وطن کی کوتاہ اندیشیوں نے ہندو مسلم
مفاہمت کو ناممکن بنا دیا اور سر سید جیسے آدمی کو مایوس کر دیا - کیونکہ مسلمانوں کی سلطنت ختم ہو جانے کے بعد
برادران وطن برطانیہ حکومت کی آڑ میں ہندو راج کے خواب دیکھنے لگے تھے - ایسی حالت میں مسلمانوں سے
اتحاد قائم رکھنا ناممکن تھا - سر سید خود بیان فرماتے ہیں -

" انہیں دنوں میں جبکہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شکسپیر سے جو اس
وقت بنارس میں کمشنر تھے میں مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں کچھ گفتگو کر رہا تھا
اور وہ متعجب ہوکر میری گفتگو سن رہے تھے کہ آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقعہ ہے کہ
میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے - اس سے پہلے تم ہمیشہ تمام ہندوستانیوں

کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے - میں نے کہا مجھے اب یقین ہو گیا ہے -
کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی - ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے
اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں
بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہیگا وہ دیکھیگا - مسٹر شکسپیر نے کہا اگر آپ کی پیشینگوئی
صحیح ہے تو نہایت افسوس ہے میں نے کہا مجھے بھی بہت افسوس ہے مگر اپنی پیشینگوئی پر مجھے پورا یقین ہے -"

بیسویں صدی کے آغاز سے مسلمانوں میں بے چینی اور بیداری کے آثار نمایاں
ہوئے ۱۹۰۶ء میں مولانا محمد علی کی کوششوں سے ڈھاکہ میں مسلم لیگ قائم کی گئی ۱۹۰۸ء
سے مسلمانوں کی آنکھیں کھلنا شروع ہوئیں - یورپ کی اتحادی طاقتیں ترکوں کے
خلاف نبرد آزما تھیں - جزیرۃ العرب کی طرف انگریزوں کی آنکھیں اٹھ رہی تھیں
۱۹۱۱ء میں دربار دہلی کے موقعہ پر تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان بغیر مسلمانوں کے مشورے کر دیا
گیا ۱۹۱۲ء میں طرابلس اور بلقان کی جنگوں میں برطانیہ کھلم کھلا اسلام دشمنی کا ثبوت دے رہی
یہ وہ زمانہ تھا جب اقبال نے مژدہ سنایا تھا - شعر

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

یہی عام بے چینی اور بیداری کا نتیجہ تھا کہ نواب وقار الملک جیسے معتدل مسلمان کو بھی
۱۹۱۳ء میں یہ اعلان کرنا پڑا مسلمانان ہند کی سیاست کا دور اسی اعلان سے شروع
ہوتا ہے -

" یہ آفتاب نصف النہار کی طرح اب روشن ہے کہ ان واقعات کے دیکھنے کے
بعد جس وقت مشاہدے میں آ گئے - یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسہ کرنا
چاہیئے - لا حاصل مشورہ ہے - اب زمانہ اس قسم کے بھروسوں کا نہیں رہا - خدائے ذو الجلال
والاکرام کے بعد جس پر ہم کو بھروسہ کرنا چاہئے وہ ہماری قوت بازو ہے اور اس کا نمونہ جو ہمارے
قابل احترام ابنائے وطن نے پیش کی ہے، ہمارے سامنے موجود ہے "

تحریک خلافت

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مغربی افق پر جنگ کے گھنگھور بادل امنڈ رہے تھے

مسلمان اس آنے والی جنگ میں انگریزوں کے خلاف تھے۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کا آغاز ہوا مسلمانوں نے برطانیہ کی سخت مخالفت کی۔ اس لئے کہ اس لڑائی میں برطانیہ ترکوں کے خلاف جنگ آزما تھا۔ ہندوستان کے مسلمان حکومت برطانیہ کی خارجی پالیسی کے ہمیشہ خلاف تھے۔ جنگ عظیم میں مہاتما گاندھی برطانیہ کے ساتھ تھے اور سپاہی بھرتی کر کے انگریزوں کی مدد کر رہے تھے۔ مگر مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا شوکت علی صاحب سخت مخالف تھے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ کانگریس نے برطانیہ کی بیرونی پالیسی کا ہمیشہ ساتھ دیا ہے اور مسلمانوں کا تصادم ہمیشہ ان کی بیرونی پالیسی سے ہوا ہے۔ جنگ عظیم کے بعد ترکستان میں خلافت کی قبا چاک ہوتی نظر آتی تھی۔ اتحادی طاقتیں ترکوں کو تباہ کرنے میں مصروف تھیں۔ مسلمانان ہند کے صبر کا جام اب چھلک چکا تھا۔ ہندوستان اور شرقی اسلامی ممالک کے مصائب نے ان کو مضطرب کر دیا تھا اور اب ان کیلئے میدان جنگ میں آنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

یہی وجہ تھی کہ ۱۹۱۲ء تک مسلمان لیڈروں سے گورنمنٹ نے بے حد خائف ہونا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں ہندوستان کی سیاست کا رہبر مسلمان ہی تھا۔ محمد علی کے سوا ہندوستان میں کوئی دوسرا رہبر نظر نہ آتا تھا۔ گاندھی جی جنگ عظیم میں برطانیہ کا ساتھ دے کر ابھی پچھتا ہی رہے تھے۔ ابھی ان کی آنکھیں بھی نہ کھلیں تھیں کہ بساط سیاست پر مسلمان چھا گئے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کی آزادی مسلمانوں ہی کے ہاتھوں خدا کو منظور ہے۔ خلافت کے زمانہ سے پیشتر کانگریس کا نام بھی کوئی نہ جانتا تھا۔ محمد علی مرحوم ہی نے کانگریس کو آگے بڑھایا اور خلافت کا ہم دوش اور ہم مقصد کر دیا۔ ابتدا میں مسٹر گاندھی اور دوسرے ہندو زعماء کو محمد علی مرحوم سے بہت اختلاف رہا حتیٰ کہ لالہ لاجپت رائے صدر اجلاس خصوصی کلکتہ کانگریس (۱۹۲۰ء) جس میں ترک موالات منظور ہو رہی تھی برابر اس کے مخالف رہے۔ جو ایثار اور قربانیاں ہندوستان اور اسلام کو آزاد کرانے میں مسلمانان ہند نے کی ہیں ان کو ہندوستان کی تاریخ ہمیشہ یاد

رکھے گی۔ خواہ کانگریس کے مورخ اس کو کتنا ہی چھپانا چاہیں۔

جیل جانے اور تمام تکالیف برداشت کرنے میں مسلمان پیش پیش رہے ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ چندہ صرف مسلمانوں نے جمع کیا سارے ہندوستان نے مل کر "تلک سوراج فنڈ" میں جتنا دیا اس سے زیادہ روپیہ مسلمانوں نے اس تحریک کیلئے دیا خود کانگریس کو امداد" چالیس لاکھ روپیہ خلافت کمیٹی نے دیا۔ مالی و جانی قربانی کے علاوہ سندھ اور پنجاب کے بہت سے مسلمانوں نے ہجرت کی موپلوں کی بغاوت ہندوستان میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے ایثار اور قربانی سے مسلمانوں کی سیاسی حالت پھر بے حد ترقی کر گئی۔

مسلمانوں کی یہ بڑھتی ہوئی طاقت برادران وطن کی نظروں میں کب بھلی معلوم ہو سکتی تھی۔ ان کو نظر آ رہا تھا کہ انگریز ساحل ہند پر رخت سفر باندھے ہوئے کوچ کی تیاری میں ہیں۔ ہندوستان آزاد ہوا چاہتا ہے مگر آزادی کے بعد مسلمان ہی حکمران ہوگا۔ اس لئے کہ وہ منظم ہیں، پرجوش ہیں اور بیدار ہیں۔ آہ! یہ ایسی داستان ہے جس کو خدا کے لئے کانگریس زدہ مسلمان ایک لمحہ کے لئے سوچیں ان کو ایک لمحہ کے لئے غور کرنا چاہئے کہ جب ہندو انگریز کو بھگانا چاہتا تھا تو اس وقت جب کہ ان کی حیات سیاسی کی ہندوستان میں کوئی گنجائش ہی نہ تھی کیوں تمام تحریک خلافت کو بند کر دیا گیا۔ کیا وجہ ہوئی کہ ایک ذرا سے واقعہ چوری چورا سے گاندھی جی نے تمام تحریک کو یکلخت روک دیا۔ یہ اب معمہ نہیں رہا ہر دانشمند آدمی سمجھ سکتا ہے کہ گاندھی جی کو ہندوستان کی آزادی میں ہندوؤں کی موت نظر آ رہی تھی۔ ان کو نظر آ رہا تھا کہ افغانستان ہندوستان آنے کے لئے بے چین ہے۔

یہی وجہ تھی کہ جب سب اسیران قوم جیل میں تھے تو گاندھی جی نے ایک معمولی سے واقعہ کی بنا پر جو بمقام چوری چورا ضلع گورکھپور میں ہوا۔ اتنی زبردست تحریک کو یکلخت روک دیا جو ابھی کامیابی کی آخری منزل تک پہنچ چکی تھی۔ یہ ایسا صدمہ ہے جس کو مسلمان کبھی نہیں بھول سکتا۔

مسلمانوں کا ایثار

اے نوخیز نوجوانان سرفروش اور اے گرفتاران دام سیاست! خدا کیلئے تم ہی بتاؤ کہ ان فخریہ واقعات کے بعد تمہارے دماغ میں بھی یہ تخیل آتا ہے کہ برادران وطن ہندو جنگ آزادی میں تمہیں پیچھے دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیا تم جذبات سے اسقدر متاثر اور کیا تعصب کی عینک نے تمہاری بینائی اس قدر کمزور کردی ہے کہ تاریخ کی ناقابل انکار حقیقت تمہاری رہنمائی پر کمربستہ ہے اور تم آگ کے طوفان میں کودنے پر آمادہ ہو۔ کیا تم اپنی عقل و فراست کو گذشتہ تاریخ سے وابستہ کرکے یہ بتا سکتے ہو کہ برادران وطن نے ملک کی آزادی میں کم کون سی قربانی زیادہ پیش کی ہے میں جانتا ہوں۔ شعر

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اغیار کی کوششیں آج تمہارے اندر انتشار پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئی ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ مالی اور تعلیمی حالت میں تم برادران وطن سے بہت پیچھے ہو اور حقیقتاً مسلمان انگریز اور ہندو کا صحیح معنوں میں شکار ہوچکے ہیں مگر کیا آئندہ ہونے والا مؤرخ ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں تمہاری قربانیں پیش پیش نہیں دیکھے گا۔ کیا سرحد کے تمہارے نوجوانوں کے خون سے رنگی ہوئی لالہ زار زمین اور اس زمین کے شہداء کی روحیں تمہارے مکمل ایثار کی شہادت نہیں دے رہی ہیں۔ کیا حضرت شیخ الہندؒ جیسا رئیس الاحرار اور محمد علی جیسا امام گوادا بھی مع ہندوستان کی آزادی کے لئے برباد کرنے والا انسان آزادی ہند کی مشعل کے علمبردار نہیں ہے۔ اگر ہندو کوئی قربانی انسانی خون کی پیش کرسکتا ہے تو وہ صرف بھگت سنگھ کا خون ہے جس کو پھانسی کی سزا دی گئی تھی لیکن اس خون کے بدلے میں انھوں نے انگریزوں کا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اس ایک خون کا بدلہ بھی کانپور کے مسلمانوں سے اچھی طرح لے چکے ہیں۔ اس لئے کہ کانپور کا قتل عام صرف اسی بنا پر شروع ہوا تھا کہ بھگت سنگھ کی پھانسی کے بعد مسلمانوں نے ہڑتال نہیں کی تھی اگر اس سے زیادہ ہندوؤں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے کوئی خون بہایا ہو تو خدا کے لئے ہمیں

کوئی بتائے۔

ہمیں ۱۹۲۰ء کے بعد کا سنگھٹن کا واقعہ یاد ہے۔ جب مسلمانوں کی تحریک خلافت ختم کرنے کے جالان کی تنظیم کا خاتمہ ہوچکا تھا اور ہندو جو مسلمانوں کی طاقت سے زمانہ تحریک خلافت میں خوفزدہ ہوگئے تھے اب یہ منصوبے سوچنے لگے تھے کہ پہلے مسلمانوں کو ہندوستان سے نکالا جائے یا انگریز کو۔ شردھانند نے یہی رائے دی تھی کہ پہلے مسلمانوں کا اخراج ضروری ہے اور اخراج کی اسکیموں کے ساتھ ہی سنگھٹن بھی ضروری ہے تاکہ جتنے مسلمان بھی کم ہوسکیں اتنا ہی اچھا ہے۔

"سوامی شردھانند پہلا شخص تھا جس نے ہندوؤں کو شدھی کی طرف راغب کیا۔

(سوانح عمری سوامی دیانند صفحہ ۱۳۴)

جن صاحب نے شدھی اور سنگھٹن تحریک کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ تمام برادران وطن گاندھی سے لیکر ڈاکٹر مونجے اور شردھانند تک آزادی ہند کے تخیل سے علیحدہ ہیں ان کا مقصد صرف گورکھشا ہندی کا پرچار اور ہندو حقوق کی ترقی کرنا ہے۔

شدھی کی غرض و غایت مولوی ظفر علیخان کے لفظوں میں

"اسلام اور مسلمانوں کو ہندوستان سے نیست و نابود کرنے کے لئے یہ زہریلے سنگھٹنے جنہوں نے مذہب کو سیاست کا کھلونا بنا رکھا ہے طرح طرح کے خوفناک منصوبے گانٹھ رہے ہیں جن کا لب لباب یہ ہے کہ روپے کے لالچ اور پروپیگنڈے کے زور سے غریب مسلمانوں کو ہندو دھرم میں داخل کر لیا جاوے۔ جو مسلمان مرتد ہونے سے بچ رہینگے۔ وہ آٹے میں نمک کے برابر رہ جائینگے اور ان کی اقلیت ہندو اکثریت میں دیکھتے دیکھتے بے اثر رہ جائیگی"

(اخبار زمیندار ۲۰ جنوری ۱۹۲۶ء)

ہمارے مسلمان کانگریسی اصحاب اس کا جواب یہ دیا کرتے تھے کہ یہ سب کام شردھانند کے تھے اور وہ سرکاری آدمی تھا۔ لیکن جس شخص نے پنڈت جواہر لال نہرو کی سوانح عمری کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ یہ جواب دینے کے بجائے اپنی گردن شرم سے جھکا لے گا اس لئے

کہ انھوں نے اس کتاب میں جیسی تعریف شردھانند کی قوم پرستی اور ایثار کی کی ہے اتنی کسی اور کی نہیں کی۔ شردھانند بہت بڑا کانگریسی تھا اور جو حرکات اس نے اس زمانے میں کی تھیں وہ سب کانگریس کی ایما سے کی تھیں۔ ورنہ جواہر لال اس کی اتنی تعریف نہ کرتے اور آخر میں یہ لکھتے کہ "اس کو ایک مذہبی دیوانے نے شہید کر دیا"۔ گویا کہ شردھانند پنڈت جی کی نظروں میں "شہید قوم" ہیں اور اگر شردھانند کی شدھی اور سنگٹھن کی اسکیمیں قوم پرستی کے خلاف تھیں اور یقیناً تھیں تو اسکی وفات کے بعد گاندھی جی وغیرہ نے یادگار شردھانند کے لئے دس لاکھ روپیوں کا اپیل کیوں کیا تھا۔ اسکی غرض "زمیندار" سے سنیئے۔

"دس لاکھ روپیہ کا جو اپیل شردھانند کی وفات کے بعد مالوی جی، لالہ لاجپت رائے، مدن موہن ناتھ اور دوسرے ہندو پرستوں، گاندھی جی وغیرہ کیطرف سے یادگار شردھانند قائم کرنے کے لئے ہوا ہے اس کی غایت الغایات یہی ہے کہ دنیا میں تو نہیں لیکن کم از کم ہندوستان میں کوئی مسلمان باقی نہ رہے۔"

(زمیندار ۲۶ جنوری ۲۷ء)

صرف یہی نہیں گاندھی کے مضامین "ینگ انڈیا" میں بھرے پڑے ہیں جنمیں ہزار دس مرتبہ انھوں نے شدھی اور ہندو مسلمانوں کی جنگ کے موقع پر ہندوؤں کی بزدلی اور کمزوری کا ماتم کیا ہے اور ان کو ان کی عورتوں کی عصمتوں کی قسمیں دلا دلا کر ابھارا ہے۔ غرضیکہ یہ ہے کہ مسلمان اب بھی فرقہ پرست اور غدار ہے اور ہندو اپنے آپ کو آزادی کا علمبردار تصور کرتا ہے۔

برادران وطن کا طرز عمل انگریزوں کی خوشامد کرنے اور مسلمانوں کو تباہ کرنے میں ہمیشہ رہا ہے اسکا اصول بھائی پرمانند کے مندرجہ ذیل الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔ "پنجاب میں اگر راجہ رنجیت سنگھ کا راج ہوتا تو سرکار انگریزی کا دہلی کے تخت پر قابض ہونا ناممکن تھا۔ ہندوستان پر حملوں کی ایک ہی راہ ہے اور اس راستہ میں پنجاب بڑی رکاوٹ رہا ہے۔ اب بھی اگر سرکار کو شمال مغرب کی طرف سے خطرہ ہو تو سرکار کو پنجاب کے ہندوؤں کی امداد پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ سرحدی اقوام کے

بعد سرحد کے صوبے اور اس کے بعد پنجاب میں مسلمانوں کا غلبہ کر دینا دانا گورنمنٹ کی پالیسی نہیں ہو سکتی۔ (قوم ۷/۱ نیا جنم ص ۹)

خلافت کے بعد کانگریس کا طرز عمل

بہرحال تحریک خلافت کے ختم ہونے کے بعد برادران وطن کی تمام قوت ہندوؤں کے سنگٹھن اور مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے میں ہی صرف ہوتی رہی۔ ہندوستان کی آزادی سے وہ بالکل دور رہے۔ مسلم لیگ نے تمام آئینی تجاویز متواتر تین سیشن منعقدہ ۲۳ء ۲۵ء ۲۶ء میں منظور کر دو اصلاحات ۱۹۱۹ء کو ناکافی قرار دیتے ہوئے پاس کیں اور ۲۰ مارچ ۲۷ء کو "دہلی تجاویز" پاس کر کے کانگریس سے برابر مفاہمت کی کوشش کی مگر ان سب کوششوں کا نتیجہ "نہرو کمیٹی" کے تقرر میں رونما ہوا۔

جس زمانہ میں مولانا محمد علیؒ صاحب بیمار ہو کر بغرض علاج یورپ تشریف لیگئے ان کی غیر موجودگی کو غنیمت جانتے ہوئے گاندھی جی کے اشارے سے نہرو کمیٹی کا تقرر ہوا۔ جسکی اصل غایت منظور کردہ "تجاویز دہلی" کو الٹنا اور رد کرنا اور ہندو مہاسبھائی اسکیم کو کانگریس پلیٹ فارم سے ہندوستان کا قومی مطالبہ بنا کر پیش کرنا تھا۔

نہرو رپورٹ کا مقصد نہرو رپورٹ کا مقصد سلطنت برطانیہ کا استحکام اور ہندو حقوق کی حفاظت تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ ملک کے بالائی و بیرونی حفاظت کے ذمہ دار انگریز ہیں اور اندرونی حکومت تمام ہندو و مسلم صوبوں میں ہندوؤں کے ہاتھوں میں ہے۔ بغاوتی سنگٹھنوں کی حفاظت میں ہندو سوراج کے قیام کی کوئی اسکیم نہرو رپورٹ سے بہتر نہیں ہو سکتی تھی۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ میں کانگریس کا اجلاس پنڈت موتی لال کی صدارت

یہی بعد کو "چودہ نکات" کے نام سے مشہور ہیں

میں اور ایک آل پارٹیز کنونشن کا اجلاس ڈاکٹر انصاریؒ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ نہرو رپورٹ میں آزادی کامل کے بجائے "زیر سایہ برطانیہ حقوق نوآبادیات" نصب العین مقرر کیا گیا۔ اور حقیقت میں کانگریس کی پوری تصویر سامنے آگئی تھی۔ مولانا محمد علیؒ نے لاکھ مخالفت کی کہ وہ بجز "آزادی کامل" کو ہی منظور رکھے اور ہر چند کہا کہ نہرو رپورٹ "مدراس کی منظور کردہ مفاہمت" کے خلاف ایک صریح نقض عہد ہے مگر بے سود رہا۔ محمد علی جناح صاحب محمد علیؒ مرحوم کے مقابلہ میں نہرو رپورٹ حامی تھے اور چند ترمیموں کے ساتھ اس کو منظور کرنے پر تیار تھے۔ اس لئے انھوں نے مسلم لیگ کی ترمیمات کو جو "تجاویز دہلی" بھی کہلاتی تھیں باضابطہ کنونشن میں پیش کیں۔ مگر کانگریس ہندو راج کے نشہ میں اتنی چور تھی کہ اس نے مسٹر جناح کی ترمیمات تک کو نامنظور کر دیا۔ اور نہرو رپورٹ کو من و عن منظور کر لیا۔

یہی وجہ تھی کہ مولانا محمد علیؒ مرحوم مع اپنی پارٹی کے کانگریس سے علیحدہ ہو گئے اور یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے کہ کانگریس آزادی بالکل نہیں چاہتی اور دسمبر ۱۹۲۸ء میں خلافت کمیٹی نے بصدارت محمد علیؒ نہرو رپورٹ کو ہندوستان اور مسلمانوں دونوں کی غلامی کی دستاویز اور انگریزوں کی سنگینوں اور فوجوں کی حفاظت میں اندرونی طور پر ہندو راج قائم کرنے کی اسکیم قرار دیا۔ مولانا محمد علیؒ کے یہ الفاظ آج تک صداقت کی فضا میں گونج رہے ہیں "نہرو رپورٹ کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں پکارنے والے منادی راستوں میں پکارتے تھے کہ "خلق خدا کی ملک ملکہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا" اسی طرح نہرو رپورٹ کے تجویز کردہ دور حکومت میں منادی پکاریں گے کہ "خلق خدا کی ملک انگریزوں کا اور حکم مہا سبھا بہادر کا"۔ اب کانگریس پر ہندو مہا سبھا کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسی وقت دسمبر ۱۹۲۸ء میں ڈھاکہ میں ہندو مہا سبھا کا اجلاس مسٹر کیلکر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اور انہوں نے بالفاظ یہ اعلان کیا کہ نہرو رپورٹ ہندو مہا سبھا کو پوری طرح منظور ہے۔ اور اگر مسلمانوں کے کہنے سے ایک لفظ اور شوشہ کی بھی ترمیم

کی گئی۔ ہندو سبھا اس کی مخالفت کریگی اور نامنظور کر دیگی۔

عزیزان ملت اور بزرگان قوم! ان واقعات کے پیش نظر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ برادران وطن کے دل میں بھی وہ تخیل آزادی کا پیدا ہو بھی سکتا ہے جو ایک معمولی مسلمان کے دل میں بہادر شاہ کی اولاد کو دہلی کے کوچوں میں کاسۂ گدائی ہاتھ میں لئے ہوئے حسرت بھری نظروں سے بھیک مانگتے ہوئے دیکھ کر پیدا ہو سکتا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ دہلی اور آگرہ کے لال قلعہ کے ویران محلوں اور تخت طاؤس کی جگہ ٹوٹے ہوئے پتھروں، دیوان عام اور دیوان خاص میں مسند شاہی کے بجائے خشک گھاس کی یادگار گارسلوں کو دیکھ کر ایک مسلمان خون کے آنسو نہ روئے وہ کون بدبخت ہے جو تاج محل کی شاندار عمارت کو دیکھ کر شاہجہاں کا تخیل دماغ میں پیدا نہ کرے اور وہ کون سا دل ہے جو قبرستان شاہی میں جا کر یہ مرثیہ نہ پڑھے۔

توانگر شاہوں کی ہے یہ منزل حسرت فزا — دیدۂ عبرت بخراج اشک گلگوں کر ادا
ہے تو گورستان مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے — آہ! اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

ہم نے کم و بیش ایک ہزار سال تک ہندوستان کی سرزمین میں تجارت بادشاہت ارزانی کی، رعایا پروری اور جہانبانی کی ہے ہم نے یہاں کی سرزمین میں اس وقت دنیا کو رواداری اور انصاف کا درس دیا ہے۔ جب کہ خاص اسی وقت انگلستان کی سرزمین پر رواداری کا نام سنا بھی نہ گیا تھا۔ تو کیا ہم اپنے ان کارناموں کو بھول سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔

دل ہمارے یاد عہد رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

ہمارا ہر ہر کارنامہ ہم کو آزادی کا سبق یاد دلاتا ہے۔ سلطنت برطانیہ اور یورپ کے خلاف آزادی کی اگر کوئی آواز ہو سکتی ہے تو وہ صرف مسلمانوں کی ہو سکتی ہے۔ وہ آواز محمد علیؒ کی ہو سکتی ہے۔ گاندھی اور مالویہ کی ہرگز نہیں۔

ہندوستان کا چارج انگریزوں سے ہم نے لیا ہے۔ اگرچہ وہ برادرانِ وطن کی
[illegible] کم فہمی کی بنا پر سہی۔ لیکن فرض ہمارا ہے کہ ہندوستان کی گم شدہ آزادی کو
واپس لیں۔ بیرونی تسلط کا اگر کوئی حقیقی دشمن ہو سکتا ہے تو وہ مسلمان ہے۔ اس لئے
کہ مسلمان کا مذہب آزاد فضا ہی میں پنپ سکتا ہے۔ مسلمان خوب جانتے ہیں کہ ان کا مذہب
(پرسنل لا یعنی شخصی قانون) ان کا پورا انگریزی بیرونی تسلط سے جکڑا ہوا ہے۔ کیا ہمارے ان
خانقاہ نشین علماء کا یہ زعم صحیح ہے کہ چونکہ ہماری پانچ وقتوں کی نمازوں میں کوئی [illegible]
نہیں ہے ہمارا مذہب آزاد ہے۔ ہرگز نہیں۔

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

مسلمانوں کے سامنے اسلامی ممالک کا مسئلہ بھی درپیش ہے۔ وہ خوب سمجھتے ہیں
کہ اگر ہندوستان بیرونی تسلط سے آزاد ہو جاتا ہے تو تمام اسلامی ممالک کی زنجیریں ٹوٹ
جاتی ہیں۔ ان کو قبلۂ اول یعنی فلسطین کا مسئلہ ایک طرف بے چین کئے ہوئے ہے تو
دوسری طرف ان کو افرنگ کی تجارتی چالوں کی حجاز میں بھی فکر ہے۔ اس لئے مسلمان
کا غدار سے غدار ٹوڈی بھی گاندھی سے زیادہ اور مکمل آزادی کا تخیل رکھ سکتا ہے۔

محمد علیؒ کی تقریر پارلیمنٹ میں

اس دعویٰ کا اگر ثبوت دیکھنا ہو تو مولانا محمد علیؒ کی آخری تقریر گول میز کانفرنس
میں جو مرحوم نے زعمائے انگلستان کے روبرو کی تھی اس کا ہر ہر لفظ گاندھی کی
مالویہ کی اس سے بعد ہی کی گول میز کانفرنس کی تقریر سے تقابل کرنے کے قابل ہے
لندن میں حقوق کی بھیک مانگنے گئے تھے۔ لیکن محمد علیؒ نے صرف حقوق کی جنگ میں
تھا۔ اس کے یہ الفاظ آج تک فضا میں گونج رہے ہیں۔ "مجھے اور میرے بھائی
حکومت نے [illegible] سے دو سال کیلئے جیل بھیجا تھا اس کا جرم [illegible]
ہے کہ میں ہندوستان کے لئے ایسی ہی آزادی چاہتا تھا۔ اگر [illegible]
کوئی [illegible] ہو تو میں اس کو دو سال کے لئے جیل بھیج سکوں"

میں ہندوستان میں اس وقت تک واپس جانے پر جب تک وہ غلام ہے آزادی
کی موت کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس لئے اگر آپ مجھے آزادی نہیں دے سکتے تو یہیں قبر
کے لئے چند گز زمین دینی پڑے گی۔"

مگر اس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ مسلمان تھا اور وہ کانگریس کی ہندو ذ
ہنیت سے مرعوب نہ ہو سکتا تھا۔ اسی لئے جواہر لال نے محمد علیؒ کو [illegible]
کہا ہے بھی تو ہی ایثار میں کمیاب مثال ہے۔ ورنہ محمد علیؒ کی وہ شخصیت ہے جو
ہندوستان کی آزادی کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھے جانے
کے قابل ہے۔

برادرانِ وطن اور آزادی

آزادی کی جو جد و جہد مسلمان کر سکتا ہے اس کی توقع برادرانِ وطن سے رکھنا
حسن ظن کو ضائع کرنا ہے۔ ہندوستان کی سلطنت کو مسلمانوں سے چھین کر ان کے
خیال کے مطابق انگریزوں نے ان کے ساتھ بڑا احسان کیا ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ انگریز
ان کی پوری طرح حفاظت کر رہا ہے۔ اس لئے کہ بھائی پرمانند اور ڈاکٹر مونجے سے
گاندھی جی تک کو ہمیشہ یہ خوف رہا ہے کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد افغان اور
سرحدی پٹھان ان کو ختم کر دیں گے۔

علاوہ اس کے برادرانِ وطن کی تاریخ اس ملک سے ایک ہزار برس گزشتہ تک بالکل
[illegible] نہیں ہے گذشتہ دس صدیوں میں ہندوستانی تاریخ کے صفحات مسلمانوں کے
کارناموں سے لبریز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو اس ملک کو ایک ہزار برس پہلے کی دنیا
بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے دماغ میں وہی رام اور کرشن کا تخیل ہے جو مسلمانوں کی آمد
سے پہلے تھا۔ ان کا دل دہلی کے لال قلعہ، آگرہ کے تاج محل اور ہمایوں کے مقبرہ کو دیکھ کر
[illegible] سکتا۔ ان کی کوئی قومی قربانی تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ جس کی یاد وہ منا سکیں اور
انگریزوں کے خلاف جذبات پیدا کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ان کو نفرت ہو سکتی ہے تو انگریزوں
سے زیادہ مسلمانوں سے ہو سکتی ہے اس لئے کہ ان کی نظر میں مسلمانوں کی وہی بازگشت ان کے

خلاف ہے۔ جو انگریزوں کی مسلمانوں کے خلاف جس طرح انگریزوں نے ملک مسلمانوں سے چھینا۔ اسی طرح مسلمانوں نے ہندوؤں سے حاصل کیا تھا اس کے باوجود کہ مسلمان حکمرانوں نے ہندوستان کی ہر چیز کو ہندوستان ہی میں محدود رکھا اور ہندوستان کی تہذیب اور عظمت کو چار چاند لگا دئیے مگر ان کے دل میں مسلمان کے خلاف وہی نفرت موجود ہے۔ جو مسلمان کے دل میں انگریز کے خلاف ہو سکتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ برادران وطن کو ہندوستان سے باہر کہیں مقدس مقامات وغیرہ کی حفاظت کا خیال نہیں ہے ان کے دل میں یورپ کے خلاف وہ جذبات پیدا نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ انکے ہم مذہب لوگ ہندوستان سے باہر یورپ کے پیچھے نہیں ہیں ان کی تمام سیاست ہندوستان ہی میں محدود ہے۔ جب کہ مسلمان مذہباً آزاد ہیں اور جبکہ ان کا مذہبی عقیدہ یہ ہے کہ۔

غلامی کیا ہے ذوق حسن و زیبائی سے محرومی — جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر — کہ دنیا میں فقط مردان حر کی آنکھ ہے بینا

اور جب کہ ان کے مذہب کے مطابق سب سے بڑا جہاد ہی ظالم بادشاہ کے خلاف آواز بلند کرنا ہو تو آزادی کے تخیل کا ان سے زیادہ اور کون مالک ہو سکتا ہے۔ برخلاف انکے ہندوؤں کا مذہبی اور کتابی عقیدہ ہے کہ اگر کوئی ظالم بادشاہ حکومت پر برسر اقتدار ہو جائے تو اس کے خلاف آواز مت اٹھاؤ اس لئے کہ وہ تمہارے گناہوں کے بدلہ مسلط کیا گیا ہے۔ اس سے بغاوت کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ ع

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

حضرت مولوی احمد سعید صاحب کا یہ لطیفہ مجھے کبھی نہیں بھولتا کہ "ہندوؤں کا تعلق ہندوستان سے صرف ان کی زندگی تک ہے۔ مرنے کے بعد ان کی لاش جلا دی جائیگی بعد میں نہ معلوم وہ آواگون کے مطابق کون سے ملک میں جنم لے لیں۔ عجب نہیں وہ انگلستان کی بالڈون پارٹی ہی میں جا پیدا ہوں مگر مسلمانوں کو زندگی میں جتنی زمین کی ضرورت ہے مرنے کے بعد بھی اس سے زیادہ زمین اس کی قبر کے لئے درکار ہوگی۔ وہ اسی سرزمین میں پیدا ہوا اسی سرزمین میں دفن ہوگا اور قیامت کے روز اسی سرزمین سے اٹھے گا۔

منها خلقناكم وفيها نعيدكم ومنها نخرجكم تارة اخرى

کانگریس اور آزادی کی جد و جہد

عطا کی ہے مجھے تہذیب حاضر نے وہ آزادی — کہ ظاہر میں تو آزادی ہو باطن میں گرفتاری

ہم نے دیکھ لیا کہ جہاں تک ادائے فرض اور تاریخی واقعات کا تعلق ہے برادران وطن آزادی کے لئے لڑ نہیں سکتے وہ اس حد سے آگے تجاوز ہی نہیں کر سکتے کہ ان کو پورے پورے حقوق اسی طرح دیئے جاویں جس طرح افریقہ وغیرہ میں مل گئے ہیں لیکن ابھی یہ سوال باقی ہے کہ موجودہ ہندو ذہنیت اور کانگریس کا طرز عمل کیا ہے؟ کیا وہ باوجود ان تمام واقعات کے بھی ہندوستان کو برطانیہ سے پاک اور مسلمانوں سے ملک ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں؟ ممکن ہے گاندھی کی مسند خالی ہونے اور جواہر لال کی صدارت کے بعد سے فضا بدل گئی ہو اور کانگریس ہندوستان کو اسطرح آزاد کرانا چاہتی ہو جیسا محمد علی مرحوم کا تخیل تھا۔ اگر ایسا ثابت ہو جاوے تو واقعہ یہ ہے کہ ہندو قوم کا بڑا اولوالعزم کارنامہ ہوگا۔ اور میرا خود اعتقاد ہوگا کہ جس صورت سے بھی ہو سکے ان کی قیادت قبول کیجائے اگر یہ واقعہ صحیح نکل آئے تو مجھے اس میں بھی عار نہ ہوگا کہ جواہر لال کے ہاتھوں پر ہم سب بیعت کرلیں اور بلا شرط کانگریس میں داخل ہو جاویں۔

لیکن بدقسمتی سے واقعات اس کے خلاف ہیں۔ کانگریس نے اپنے ہر قدم سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہندوستان پر برطانیہ کا سایہ قائم رکھ کر پہلے مسلمانوں کے حقوق غصب کرنا چاہتی ہے حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے وہ جملے مجھے یاد ہیں جو انہوں نے غالباً الہ آباد کی تقریر میں کہے تھے کہ میں ہندو تو کیا کوئی بھی جماعت سے بھی صلح کرنے کو تیار ہوں اگر وہ انگریز کو ہندوستان سے باہر نکالنے پر کمربستہ ہو۔

میرا ان جملوں پر ایمان ہے لیکن بدقسمتی تو یہ ہے کہ وہ کوئی بھی جماعت ہندو ہی کے ٹکڑوں کے لئے لڑ رہی ہے۔ انگریزوں کے نکالنے کا تخیل ہی ان کے دماغ میں نہیں آیا۔

اگر ہندوستان کو آزاد کرانے کا ارادہ کانگریس کا ہوتا تو خلافت کی تحریک

کو جب کہ اب بام صرف دو چار ہاتھ رہ گیا تھا۔ اس طرح ختم نہ کردی جاتی اور ۱۹۳۰ء
میں جاس کامیابی کے وقت (لارڈ اروِن) کے پھسلانے پر گاندھی اروِن پیکٹ نہ ہوتا
جسکو خود وہ کہتے ہیں کہ وہ میری ہمالیہ جیسی غلطی تھی"

وہی گاندھی جی جو ایک زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے دل و جان سے
کوشاں تھے۔ جو خلافت کے زمانے میں اردو لکھنا سیکھے تھے اور اپنے ہاتھ کے اردو میں
لکھے ہوئے خطوط حکیم اجمل خانصاحب وغیرہ کو جیل سے لکھا کرتے تھے (جن کی تصویریں
اکثر شائع ہوئیں) جو مسلمانوں کی مقدس کتاب کی تلاوت تک کیا کرتے تھے۔ وہی اب اردو
کو فنا کرنے کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ وہ اب صرف ہندوؤں کے حمایتی بن کر رہ
گئے ہیں۔ اب دل میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے بلکہ ان کو اب صرف
یہ خیال ہے کہ کہیں اچھوت مسلمان نہ ہوجائیں۔ ان کی علیٰحدہ اقلیت نہ تسلیم کرلیجائے
مبادا ہندوؤں کی تعداد چھ کروڑ اور کم ہوجاوے۔

محمد علی جناح نے اب سے چار ماہ پیشتر جب گاندھی جی کو خط لکھا جو کہ اخبارات
میں مع گاندھی جی کے جواب کے شائع ہوچکا ہے کہ آپ مہربانی فرماکر درمیان میں پڑ کر ہندو مسلم
مسئلہ کو حل کرنے میں مدد دیجئے۔ تو وہی گاندھی جی جو آج تمام ہندو قوم پر حکومت کر رہے
ہیں اور جو تمام طاقتیں گاؤ رکھشا اور ہندی پرچار میں صرف کر رہے ہیں اور جنھوں نے
ایک ہفتہ تک فاقہ کرکے دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا صرف اس لئے کہ اچھوتوں کو ہندوؤں کی
میں شمار کیا جائے۔ کہیں ایسا نہو کہ اچھوت انکے علیٰحدہ ہوجانے سے اسمبلی میں ہندوؤں کی
اکثریت نہ رہے۔ وہ اس خط کا جواب کہتے ہیں کہ۔ مجھ کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا
نظر آتا ہے۔ میری کوئی نہیں سنتا میں صرف خدا سے دعا کر سکتا ہوں۔ کیا جو شخص
آزادی کا خواہشمند ہو وہ ہندو مسلم اتحاد پر تمام زور صرف نہیں کرے گا۔ اور کیا یہ ممکن
نہیں ہے کہ اگر آج گاندھی یہ ارادہ کرلیں کہ جب تک ہندو مسلمانوں کے ہاتھ کا کھانا
نہ کھائیں اور جب تک وہ اپنے نسلی امتیاز کو نہ کھودیں اور ہندوستان کی آزادی کیلئے
مسلمانوں کے ہر طرح ساتھ نہ رہیں تو جان تک تیاگ دیں گے تو ہندوستان کی فضا چند ایام میں بدلجائے

گزشتہ تحریک خلافت میں جو ہندو مسلم اتحاد قائم ہوگیا تھا وہ مسلمانوں بالخصوص محمد علی مرحوم کی
کوششوں کا نتیجہ تھا اور بعد خلافت کے جو نفاق آپسمیں ہوا وہ قابل افسوس ہے
لیکن گاندھی جی کیا ان کانگریس کا کوئی لیڈر اس کو ذرہ بھی اہمیت دینے کو تیار نہیں ہے
کہ مسلمانوں سے فرقہ وارانہ حیثیت میں کوئی گفتگو کیجاوے یا کم از کم ہندو ذہنیت کو
کم کرنے کی کوشش کیجائے۔ برخلاف اس کے جواہر لال صاف صاف اپنی سوانح عمری
میں تحریر فرماتے ہیں "میں نہیں سمجھ سکتا کہ مسلم تہذیب کیا ہے میرے خیال میں تو
وہ ایک خاص قسم کا پاجامہ اور ایک ٹوپی دار لوٹا ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے
ایک اور موقع پر پنجاب میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں سو سال تک
مسلمانوں کا انتظار کر سکتا ہوں کہ وہ کانگریس میں آئیں بہ نسبت اس کے کہ ان کو
رشوت دیجائے" گویا کہ مسلمانوں سے اتحاد کرنا اور ان کو مطمئن کردینا رشوت دینے
کے مترادف ہے۔

یہ ہے ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں جو کانگریسی زعماء کی طرف سے ہو رہی ہیں
ظاہر ہے کہ اگر ان کو آزادی حاصل کرنا ہوتی تو وہ یہ سمجھ لیتے کہ آزادی آٹھ کروڑ
مسلمانوں کے بغیر نہیں مل سکتی اور مسلمانوں سے اتحاد کرنے میں وہ ہر طرح کی کوشش
کرتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس اتحاد کی قیمت خواہ کتنی ہی گراں کیوں نہ ہوتی مگر بدقسمتی سے آزادی کی کوئی جنگ
نہیں ہے حکومت میں اور کانگریس میں ساز ہوگیا ہے۔ کانگریس صرف حقوق کی حفاظت
چاہتی ہے یہ ظاہر ہے کہ حقوق مسلمانوں کے اتحاد بغیر بھی مل سکتے ہیں۔

ادھر حکومت برطانیہ کانگریس کی اس لئے خوشامد میں لگی ہوئی ہے کہ کسی طرح
آئندہ دربار کا بائیکاٹ نہ کیا جائے اور فیڈریشن میں شرکت کرلی جاوے۔ یہی وجہ ہے کہ
دونوں ایک دوسرے کے مددگار بنگئے ہیں اور الحمد اللہ مسلمانوں کو دونوں نے دشمن
سمجھ رکھا ہے۔

گوپال کرشن گوکھلے کا قول تھا کہ "ہندوستان ایک مثلث ہے جس کے تین ضلع

مسلمان، ہندو اور انگریز ہیں۔ اور علم ہندسہ کا یہ اصول ہے کہ مثلث کے ہر دو ضلع آپس میں مل کر تیسرے ضلع سے بڑے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کی سیاست میں ہندو انگریز اور مسلمان مثلث ہند کے تین اضلاع ہیں جو دو قومیں آپس میں ملجائیں گی وہ تیسری قوم پر بھاری ہونگی اس لئے ہندوؤں کو چاہیئے کہ وہ اضلاع مسلم کے خاص حقوق کو تسلیم کر کے متحدہ محاذ قائم کریں۔ کیونکہ اگر انھوں نے ایسا نہیں کیا تو وہ خود ملک کے حق میں دشمن ثابت ہونگے"۔ اس تخیل کے آخری پرچارک دیش بندھو اور داس آنجہانی تھے جنہوں نے بنگال پیکٹ (سنہ ۱۹۲۳ء) منعقد کیا۔ اور پھر انکو کوکناڈا کانگریس میں بھی پیش کیا۔ تاکہ ہندو مسلم مفاہمت ہوسکے مگر ہندوؤں کی مخالفت سے وہ رہ گیا سولن پیکٹ (سنہ ۱۹۲۳ء) کا بھی یہی حشر ہوا۔

مسٹر سری نواس آئنگر صدر کانگریس نے بھی سنہ ۱۹۲۷ء میں مولانا محمد علی کے ساتھ اتحاد کانفرنس کلکتہ اور تجاویز مدراس کانگریس سنہ ۱۹۲۷ء میں آخری کوشش مفاہمت کی کی لیکن سب کوششیں بیکار رہیں۔ اسوقت سے اب تک برابر کانگریس کی ذہنیت میں تکبر اور غرور میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور اب آخر کار وہ اس نظریہ تک پہنچ چکی ہے کہ ملک میں کسی سمجھوتے کی ضرورت نہیں رہی۔ کیونکہ اب وہ کسی دوسری پارٹی کے وجود ہی کی قائل نہیں رہی۔ اب مثلث ہند کے دو اضلاع انگریز اور ہندو آپس میں مل کر تیسرے ضلع (مسلمان) کو مٹانے پر کمربستہ ہیں لہذا ایسی صورت میں کسی ہندو مسلم اتحاد کی کوئی ضرورت ہی ان کے نزدیک باقی نہیں رہی۔

مکمل آزادی کا اعلان

جو لوگ کانگریس کی گزشتہ تاریخ سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ کانگریس نے مکمل آزادی کا اعلان کب اور کس طرح کیا اور اس کا مفہوم آج تک کیا ہے۔

مولانا محمد علی، مولانا ظفر علیخاں اور حسرت موہانی صاحبان نے احمد آباد اور کوکناڈا کے اجلاسوں میں ہر چند کوششیں کیں کہ کانگریس کا نصب العین مکمل آزادی

مقرر کردیا جائے۔ مگر ہمیشہ ناکام رہے۔ ان کا نصب العین وہی "سوراج" رہا۔ حسرت موہانی نے جب دریافت کیا کہ سوراج کی تعریف صاف صاف کردیجائے اس لئے کہ یہ ایسا لفظ ہے کہ اس سے زیر سایہ برطانیہ "حقوق" مطلب ہے تو گاندھی جی نے صاف انکار کردیا کہ اسکی تشریح نہیں کیجا سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ حسرت موہانی اور ان کی پارٹی کانگریس کے طرز عمل سے مایوس ہو کر الگ ہوگئے۔ کانگریس نے جو پنجاہ سالہ تاریخ مرتب کی ہے اس کے ۱۴ اور ۱۵ صفحات پر یہ تمام واقعات درج ہیں۔

(مولانا حسرت موہانی وہ بزرگ ہیں جو سنہ ۱۹۰۴ء میں کانگریس میں شریک ہوئے تھے جب کہ کوئی مسلمان شریک نہ تھا ان کی جو خدمات ہیں ان کی تعریف خود مہاتما گاندھی نے ینگ انڈیا میں بھی کی ہے۔ کھدر کی تحریک کے موجد مولانا حسرت ہی ہیں۔ جب وہ مولانا محمد علی اور ظفر علیخاں جیسے حضرات نے کانگریس سے مجبوراً استعفے داخل کردیے تو انکے گمان کے لئے سوچنے کا کافی موقع ہے۔ ان صاحبان نے اچھی طرح معلوم کرلیا کہ کانگریس آزادی کے لئے نہیں لڑ رہی ہے۔)

سنہ ۱۹۳۰ء میں جب "پورن سوراج" کا اعلان لاہور کے اجلاس میں پاس ہوا تو سب کو معلوم ہے کہ کن کن مصیبتوں سے وہ پاس ہوا تھا۔ گاندھی جی آخر وقت تک اسکے خلاف تھے۔ اور پاس کرنے کے بعد بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ جب گاندھی جی سے مطالبہ کیا گیا "پورن سوراجیہ" کا مطلب کیا ہے تو انھوں نے گزشتہ سال یہی لکھا کہ اسکا مطلب "رام راج" ہے۔

یہ ہے وہ مکمل آزادی کا مفہوم جو غریب مسلمانوں کو دھوکہ دے رہا ہے۔ مہاتما جی کے اس بیان کے بعد یہ خیال کرنیکی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ پورن سوراجیہ سے انکا مطلب وہ ہے جو ہمارے تخیل میں آزادی کامل کا ہے۔

کیا ہمارے لئے یہ غور طلب مسئلہ نہیں ہے کہ جو جماعت آزادی حاصل کرنا چاہتی ہے وہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی اہمیت دیتی ہے اور سوراج کی تعریف بھی عجیب پیش کرتی ہے؟

ایک طرف آزادی کا دعویٰ دوسری طرف کمیونل ایوارڈ کی سخت مخالفت، اکثر وکشا کی اسکیمیں، اردو کو فنا کرنے اور ہندی کو ترویج کی ان تھک کوششیں، مذہبی خانوں کی علانیہ مخالفت۔ یہ سب باتیں عوام کے لئے مشعل راہ ہیں۔ کاش ہم ان سے اب بھی آگاہ ہوں اور اس فریب سیاست کا جواب بھی مکمل تنظیم سے دیں۔

کانگریس اور مسئلہ وزارت

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب ۔۔۔ تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات حقوق ۔۔۔ طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

جب انگلستان کی پارلیمنٹ نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ۱۹۳۵ء گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی رو سے کیا تھا تو ہندوستان کے ہر شخص نے اس قانون کو ٹھکرا دیا اور ہندوستان کے متفقہ اور متحدہ مطالبوں سے بھی بہت کم سمجھا۔ کانگریس کا دعویٰ تھا کہ وہ مکمل آزادی چاہتی ہے مگر جب ہندوستان کی موجودہ تاریخ مرتب کیجائے گی تو کانگریس کی موجودہ پالیسی جو وزارتوں کو قبول کرنے میں بروئے کار آئی ہے۔ تاریخ کے صفحات میں نہ مٹنے والا دھبہ ثابت ہوگی اور ملک کو بھی بہت جلد محسوس ہو جائے گا کہ کانگریس نے اپنے حقوق کی بنا پر آزادی کی تحریک کو برسوں پیچھے ڈال دیا ہے۔ کانگریس اس کو خوب جانتی ہے کہ اس کے اصل مقصد کے لئے یہ طریقہ بالکل مناسب ہے کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ وہ انقلاب کی خواہاں نہیں ہے۔ بلکہ اس کی آخری تمنا صرف کونسٹی ٹیوشنل اسمبلی ہے جس کے ماتحت اکثریت کی بنا پر اقلیتوں پر حکومت کر سکے مگر وہ بیچارے مسلمان جو کانگریس کو آزادی کا علمبردار سمجھ رہے ہیں۔ ابھی تک اس مغالطے میں مبتلا ہیں کہ یہ وزارت کی کرسیاں آزادی کے راستہ کی ایک منزل ہے۔ الیکشن سے پیشتر تک کانگریس کا یہی دعویٰ تھا کہ وہ وزارتوں

توڑنے کے لئے کونسلوں پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک مرتبہ نہیں سیکڑوں مرتبہ علانیہ کہا کہ وزارتیں ہرگز قبول نہیں کیجائیں گی اس لئے کہ وہ ہم کو آزادی کے راستہ سے بہت دور کردیں گی۔ لکھنؤ میں جب کانگریس کا سیشن ہوا تو پنڈت جواہر لال نہرو اس کے صدر تھے۔ خطبہ صدارت میں انھوں نے بہ حیثیت صدر کے جو الفاظ فرمائے وہ یہ ہیں جن کو میں ان کے خطبہ صدارت سے نقل کرتا ہوں

"انھیں وجوہ کی بنا پر مجھ کو یقین کامل ہے کہ کانگریس کے لئے عہدے قبول کرنے کی تائید کرنا یا اس حالت میں پس و پیش کرنا ایک زبردست غلطی ہوگی اس زبردست گڑھے میں گرنے کے بعد ہمارا ابھرنا مشکل ہو جائیگا عملی سیاست اس کے خلاف ہے اور اسی طرح وہ کانگریس کی روایات اور ذہنیت بھی جسکو ہم عوام میں پھیلانا چاہتے ہیں۔ اسکی مخالف ہے۔ نفسیاتی حیثیت سے اس قسم کی رہنمائی ممکن ہے کہ ہلاکت خیز نتائج پر ختم ہو۔ اگر ہم انقلاب انگیز تغیرات کے حامی ہیں، جیسا کہ واقعہ ہے تو ہم اپنے ابنائے وطن میں ایک انقلاب انگیز ذہنیت پیدا کریں۔ اس کے خلاف جو تجویز بھی ہوگی مضرت رساں ثابت ہوگی"

یہ بیان اس شخص کا ہے جو کانگریس کا محبوب ترین صدر ہے اور جس کی ابرو کے اشارے پر کروروں ہندو جان دینے کو تیار ہیں۔ ایک ایک لفظ سے ظاہر ہے کہ پنڈت جی پورے ایمان اور یقین کی قوت کے ساتھ وزارتوں کو آزادی کے راستہ میں زبردست کانٹا سمجھ رہے ہیں۔ اور اصل آزادی کی راہ اس میں ہے کہ عوام میں انقلاب کی ذہنیت پیدا کیجائے بجائے اس کے کہ ان کو گورنمنٹ ہاؤس کا مہمان بنا دیا جائے لیکن جب الیکشن ختم ہوئے اور چھ صوبوں میں کانگریس کی اکثریت ہوگئی تو وہ انقلابی ذہنیت ختم ہوگئی اور وہ مشروط طریقہ پر وزارت قبول کرنے کو تیار ہوگئے یعنی اگر صوبوں کے گورنر تحریری یقین دلادیں کہ وہ وزیروں کے اختیارات میں حائل نہ ہوں گے تو وہ وزارت مرتب کر سکتے ہیں۔ کانگریس کا خیال تھا کہ گورنمنٹ الیکشن کی کامیابی سے مرعوب ہوگی اور ضرور یقین دلائے گی اور عہدے قبول کر لئے جاویں گے لیکن گورنمنٹ

جو اس قسم کے سودے چکانے میں بہت شاطر ہے۔ خوب سمجھتی تھی کہ کانگریس کی ذہنیت میں آزادی کی جنگ کا خیال بھی نہیں ہے۔ وہ حقوق کی طالب ہے۔ اور ضرور خود بخود عہدوں کے لئے جھکے گی، صاف انکار کر دیا کہ کوئی یقین نہیں دلایا جا سکتا۔ کانگریس اس طرز عمل سے سخت پریشان ہوگئی۔ اب اس کے لئے کوئی راستہ نہ تھا وہ پچھتاتی تھی کہ یہ کیا ہوگیا۔ گاندھی جی اپنے بیان کی تاویلات پیش کرتے کرتے تھک گئے تھے وہ صاف اعلان کر رہے تھے۔ کہ میرا مطلب تو یقین سے صرف اتنا ہے کہ روزانہ کے معمولی معاملات میں وزراء کے کاموں میں کوئی مداخلت نہ کی جاوے۔ دنیا کا ہر اخبار کانگریس کے اس مضحکہ خیز طرز عمل پر ہنس رہا تھا کہ یہ کیسی آزادی کا دعویٰ ہے کہ روزانہ گورنمنٹ کے سامنے جھکتے جا رہے ہیں کہ جس طرح بھی ہو عہدے مل جائیں ورنہ آزادی کی راہ تو سامنے موجود تھی۔ کونسلوں کا بائیکاٹ کرنا آزادی کی جنگ کے لئے سب سے پہلا فرض تھا

لیکن ان تمام خوشامدوں کے باوجود گورنمنٹ نے کوئی تحریری اطمینان نہیں دلایا۔ اور جو اس قوم کو کرنا چاہیے تھا۔ جو حقوق کی جنگ لڑتی ہے وہی کیا گیا اور جولائی میں گاندھی جی کے مشورہ کے بعد عہدے قبول کرنے ہی پڑے اور وہی جواہر لال جی جو یہ فرماتے تھے۔ کہ عہدے آزادی کے لئے سم قاتل ثابت ہوں گے ان کو شیریں گھونٹ سمجھ کر چڑھا گئے۔ اور یہ فرمادیا کہ "مجلس عاملہ کا فیصلہ صحیح ہوتا ہے"۔

یہ ہے وہ ذہنیت جو دنیا کے سامنے ہے گر غریب عوام کی نظروں سے چھپائی جا رہی ہے۔ کانگریس کی اچھی خاصی جماعت آخری وقت تک عہدوں کے خلاف رہی۔ اس سلسلے میں جو بیان عہدوں کے قبول کرنے کے فیصلہ کے بعد آنریبل رفیع احمد قدوائی صاحب موجودہ وزیر مالیات نے اس وقت دیا تھا۔ وہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے۔ کہ کانگریس نے آزادی کی جنگ کو کتنا گہرا دفن کر دیا ہے انھوں نے ایک تحریری بیان میں فرمایا کہ:-

"ہم کو اپنی مکمل شکست کا پورے طور سے اعتراف کر لینا چاہیے برٹش ڈپلومیسی پورے طور سے ہمارے خلاف کامیاب ہوگئی

اب گورنمنٹ کو کانگریس کا کوئی خوف نہیں رہنا چاہیے اس لئے کہ وہی کانگریس جو عوام میں انقلابی ذہنیت پیدا کرنا چاہتی تھی اب سرکار برطانیہ کی دوست ہوگئی"۔

اس بیان کو وہ مسلمان پڑھیں اور اپنا سر دھنیں جو کہ اپنی مصیبتوں کا علاج اسی جماعت میں سمجھتے ہیں۔ جو صرف ہندوؤں کے چند حقوق کی حفاظت میں سرگرم عمل ہے۔ غضب یہ ہے کہ الیکشن سے پیشتر تک تمام لیڈروں کی تقریریں ان الفاظ سے بھری پڑی تھیں کہ اسمبلیوں میں موجودہ قانون کو توڑنے اور ختم کرنے جا رہے ہیں۔ لیکن جب وزارتیں قبول کیں اور جو شخص بھی واردھا میں گاندھی آشرم سے باہر آیا وہ قانون کو چلانے کی ترغیب دے رہا تھا۔ اب "ختم کرنے" کے بجائے "چلانے" کا لفظ زبان زد عوام ہوگیا ہے۔ ہیچ بتو تو اے چرخ گرداں تفو۔

اچھا اگر کانگریس واقعی آزادی کی حامل ہے تو پھر حلف وفاداری کے کیا معنی ہیں جو انھوں نے اسمبلیوں میں اور کابینہ وزارت میں اٹھایا۔ حلف کے الفاظ یہ ہیں۔

"میں ایمانداری سے اقرار کرتا ہوں کہ میں شہنشاہ معظم، اس کے ورثا اور ان کی اولاد کا حقیقی وفادار رہوں گا اور اپنے فرائض کو بہترین قابلیت اور علم کے ساتھ انجام دوں گا"۔

جس کے بعد اگر حلف کوئی چیز ہے تو شہنشاہ برطانیہ اور اس کی حکومت کے خلاف ایک لفظ کہنا بھی گناہ عظیم ہے اور اسکی اولاد در اولاد کی وفاداری لازم آجاتی ہے

ابھی حال ہی میں جب یو۔ پی۔ اسمبلی میں ان سے دریافت کیا گیا کہ مکمل آزادی سے آپ کا مطلب کیا سلطنت برطانیہ سے قطع تعلق کرنا ہے۔ تو کانگریسی ممبران نے ایک ساتھ جواب دیا کہ "ہاں" مگر جب یہ سوال کیا گیا کہ "یہ حلف وفاداری" کیا معنی رکھتا ہے تو کوئی جواب نہ تھا۔ خاموشی ہی خاموشی تھی۔

حکومتِ کانگریس اور مسلم وُزراء کا تقرر

ہر وہ قوم جو آزادی چاہتی ہے متحدہ محاذ قائم کرکے بیرونی تسلط کا مقابلہ کرتی ہے۔ اور دوسری قوم کو اپنے ساتھ لینے کی حتی الامکان کوشش کرتی ہے۔ تاکہ دشمن کے خلاف جتنی آوازیں بھی متحدہ ہو سکیں اتنا ہی اچھا ہے۔ اس طرح اسمبلی میں جاکر اگر کانگریس کا مقصد آزادی کی منزل کا قریب تر لانا تھا تو پھر اس جماعت سے وہ اتحاد قائم کرتی جو اپنے مقاصد اور نصب العین میں اس سے قریب ترین تھی۔ اس کو اقلیت پارٹی کو اطمینان دلانے اور ان کی تمام شرائط کو منظور کرنے میں خود آگے بڑھنا چاہیے تھا تاکہ سب قومیں ایک ساتھ جمع ہو کر حکومت کا مقابلہ کر سکیں۔ مگر کانگریس کا جو طرز عمل اس معاملہ میں رہا وہ حد درجہ پست ذلیل اور قابل افسوس ہے۔

ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے مسلم چیف منسٹروں نے اپنی کابینہ میں فراخ دلی سے ہندو وزراء کو ہندو پارٹیوں کا نمائندہ تسلیم کرتے ہوئے مقرر کیا یہاں تک کہ پنجاب اور بنگال میں قریب قریب نصف ہندو مقرر کئے گئے مگر کانگریس کی حالت بھی ملاحظہ ہو اڑیسہ میں ایک مسلمان بھی وزارت میں نہیں لیا گیا۔ اگر مطالبہ کیا گیا تو جواب آیا کہ کوئی آدمی قابل نہیں ہے۔ بہار میں صرف ایک مسلمان ہے۔ بمبئی میں صرف ایک ہے۔ اور یوپی میں دو ہیں اور ان وزراء کو بھی جن طریقوں سے مقرر کیا ہے وہ مسلمان وزراء کے لئے اور عام مسلمانوں کے لئے حد درجہ شرمناک ہیں۔ جو مسلمان کانگریس حکومت میں وزیر بنائے گئے ان کو مسلمانوں کا نمائندہ تسلیم کرکے یا کسی دوسری مسلم پارٹی سے صلح کرکے نہیں بلکہ ان کو مجبور کیا گیا کہ وہ کانگریس کے اقرار نامہ پر دستخط کریں۔ یعنی اس کا ان کو کوئی حق نہ ہوگا کہ وہ مسلمانوں کی طرف سے کوئی مطالبہ پیش کر سکیں بلکہ کانگریس کے پروگرام کے موافق ہر کام انجام دینا ہوگا۔

وزراء کی کابینہ ایک ایسی جماعت ہوتی ہے جس کی تمام کارروائیاں خفیہ ہوا کرتی ہیں۔ اسی لئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے "ہدایت نامہ" میں صاف الفاظ میں کہ وزارت مرتب کرتے وقت اقلیتوں کی نمائندگی کا خیال برابر رکھا جائے یعنی اقلیتوں میں سے ان کی منشاء کی مطابق ان ہی کے نمائندوں کو وزیر بنایا جاوے تاکہ اگر کابینہ میں کوئی بات ان کی جماعت کے خلاف پیش ہو تو وہ احتجاج کر سکیں۔ مثلاً اگر وزارت یہ قانون پاس کرے اور یقیناً عنقریب ایسا ہونے والا ہے کہ اسلامیہ اسکول جو ابتک قائم ہیں انکی امدادیں بند کردی جاویں تو مسلم وزراء کو جو کانگریس پلیج پر دستخط کر چکے ہیں کوئی حق نہیں رہتا کہ وہ انکے خلاف آواز اٹھا سکیں۔

یہ صرف اس لئے کیا گیا کہ دوسری صورت میں دوسری جماعتوں سے صلح کرنا پڑتی اور کانگریس اس بات کو پسند نہیں کرتی تھی۔

مسلم وزراء کے تقرر میں جو بے ایمانی کانگریس نے کی ہے اس میں گورنر اور حکومت انگلشیہ بھی اتنی ہی ذمہ دار ہے۔ حسرت موہانی کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ گورنروں اور کانگریس حکومت کی باہمی سازش کے خلاف فیڈرل کورٹ میں جو دہلی میں قائم کی جا رہی ہے۔ مقدمہ دائر کرنا چاہئے۔

یوپی مسلم لیگ کی ناکام کوشش مصالحت

مولانا حسین احمد صاحب کے لیگ سے استعفیٰ دینے کا ایک بڑا سبب بتلایا جاتا ہے کہ لیگ نے کانگریس سے مصالحت کی کوئی کوشش نہیں کی مگر حقیقت ہے یہ ان کی رائے ہے جن کو تصویر کا صرف ایک پہلو دکھایا گیا ہے۔ لیکن جن کو معلوم ہے کہ کانگریس نے لیگ کے ساتھ کیسا مغرورانہ طرز عمل اختیار کیا ہے۔ وہ مولانا کی بے بسی سے زیادہ اس ذہنیت پر ماتم کریں گے جو کانگریس کے توہین آمیز طرز عمل سے واقف ہونے کے باوجود مسلمانوں کی تنظیم کے خلاف ہیں اور کانگریس کو آزادی

کا واحد علمبردار سمجھتے ہیں۔

یو۔پی مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر چودھری خلیق الزماں صاحب نے ہر کوشش اس بات پر ختم کر دی کہ کانگریس اور لیگ میں مصالحت ہو جائے اسکی وجہ یہ ہے کہ چودھری خلیق الزماں صاحب اٹھارہ سال سے کانگریس کے سرگرم ممبر رہے ہیں۔ صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی کے صدر اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی استقبالیہ کمیٹی کے چیرمین بھی رہ چکے ہیں۔ ان کا لیگ سے کوئی تعلق بھی نہ تھا۔ مگر علماء کے اصرار سے انہوں نے کانگریس سے استعفیٰ دے کر مسلمانوں کی تنظیم کو منظور کیا۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ کسی طرح کانگریس اور مسلمانوں کا باہمی سمجھوتہ ہو جائے مگر بعد میں افسوس کے ساتھ ان کو اعلان کرنا پڑا کہ کانگریس اپنے دروازے مسلمانوں کے لئے اسطرح کھولنے کو تیار نہیں ہے کہ وہ باعزت اندر داخل ہوں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر مسلمان کانگریس میں جاویں تو من حیث الجماعت داخل ہوں۔ یا تو کانگریس خود دروازہ کھولدے تاکہ باعزت داخلہ ہو جائے یا اپنے اندر ہم اتنی طاقت پیدا کر لیں کہ دروازے کو توڑ کر داخل ہو جاویں۔ درمیانی صورت مسلم مفاد کے سخت خلاف ہے۔

بہر حال اپریل سے جولائی تک انہوں نے ہر امکانی کوشش کی کہ کسی طرح کانگریس لیگ کو اپنے اندر شامل کرکے متحدہ محاذ قائم کرے۔

میں ذیل میں وہ توہین آمیز شرائط تحریر کرتا ہوں جن کو کانگریس نے لیگ کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور لیگ نے ان کو بالکل تسلیم کر لیا تھا۔ مولانا آزاد کے بیان مورخہ ۳۰۔ جولائی کی رو سے مندرجہ ذیل شرائط لیگ کے سامنے رکھی گئیں۔

(۱) لیگ اپنی پارٹی ختم کر دے۔ (۲) اپنا پارلیمنٹری بورڈ بھی ختم کر دے۔ (۳) آئندہ ضمنی الکشنوں میں لیگ کانگریس کے خلاف کوئی آدمی کھڑا نہ کرے (۴) لیگ کانگریس کے پروگرام کے ماتحت پورے طور سے کام کرے (۵) اگر کانگریس پارٹی اسمبلی سے استعفا دینے کا فیصلہ کرے تو تمام مسلمان ممبر بھی اس کے حکم پر استعفا دینگے۔

لیگ نے تمام شرائط کو باوجود غیر منصفانہ ہونے کے منظور کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ اتنی ذلیل شرط کو بھی مان لیا تھا کہ اپنی پارٹی ختم کر دیجائے گی اور کانگریس کی تمام کارروائیوں سے اتفاق کرنا ہوگا۔ مگر لیگ نے ایک شرط رکھنی چاہی کہ جہاں تک کمیونل ایوارڈ زبان اور مسلمانوں کے مذہب کا تعلق ہے۔ مسلم لیگ کے ممبران آزادی بحیثیت مسلمان کے رائے ظاہر کر سکیں گے اس کو ابوالکلام صاحب آزاد اور گووند ولبھ پنتھ تسلیم کرنے کو تیار تھے۔ مگر جواہر لال نے صاف صاف انکار کر دیا۔ اور کہا کہ وہ اپنے آپ کو بلا شرط حوالہ کر دیں۔

آخر کار چودھری خلیق الزماں صاحب کو بصد ہزار افسوس اعلان کرنا پڑا کہ "گفت وشنید۔ آج سے قریبا ۲ ہفتہ پیشتر شروع ہوئی تھی ۳۰۔ جولائی کو اس طرح ناکام ثابت ہوئی اب مجھے معلوم ہو گیا کہ میں ایک ناممکن چیز کے حصول کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اگرچہ لیگ کا اس طرح مصالحت کرنا بہت ہی ذلت کا باعث تھا۔ مگر کانگریس نے اس کی ایک واحد شرط کو ٹھکرا کر جو شکل پیش کی ہے اس سے اس کی اصلی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ جب کانگریس ہماری یہ شرط بھی منظور کرنے کو تیار نہیں ہے۔ تو مسلمانوں کے لئے کس قدر ذلت کا باعث ہے کہ وہ اسی دروازے کو کھٹکھٹائے جاتے ہیں اور اپنی تنظیم سے بالکل بیخبر ہیں۔ کیا کوئی خود دار انسان بھی اسکو گوارا کر سکتا ہے کہ خالص مذہبی معاملات میں بھی بحیثیت مسلمان ہونے کے اس کو رائے دینے کا حق باقی نہ رہے۔

لیگ پارٹی کا اتنا گر کر صلح کی کوشش کرنا اور کانگریس کا ٹھکرا دینا مسلمانان ہند کے لئے درس عبرت ہے۔ واقعہ صرف یہ ہے کہ انتخابات عام سے پہلے کانگریس کا اندازہ تھا کہ بعض صوبوں میں بالخصوص یو۔پی میں بغیر لیگ پارٹی کی مدد کے وزارت مرتب نہ ہو سکے گی۔ اس لئے دوران انتخابات میں کانگریس نے لیگ سے مفاہمت کی گفت وشنید جاری رکھی مگر الیکشن کی غیر متوقع زبردست کامیابی نے کانگریس کو یکسر نازی اور فسٹ پارٹی میں بدل ڈالا اور پارٹی ڈکٹیٹر شپ کے نشہ نے اس کو مدہوش کر دیا۔ پارٹی ڈکٹیٹر شپ ایسی لعنت ہے جسکی موجودگی میں

دوسری پارٹیوں سے صلح کی گفت و شنید کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔
پارٹی مطلق العنانی مغربی ممالک میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ جہاں مذہب کا سوال زیادہ درپیش نہیں ہے۔ جہاں کوئی اکثریت یا اقلیت مستقل نہیں ہے۔ لیکن ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کی اقلیت اور اکثریت مذہبی تفریق کی بنا پر ہیں، اسکے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہو سکتا کہ ملک کی مختلف پارٹیاں آپس میں سمجھوتہ کر کے متحدہ محاذ بنا لیں یہ بالکل ناممکن ہے کہ تمام پارٹیاں ایک پارٹی میں جذب ہو جاویں بالخصوص جب کہ وہ پارٹی ایک خاص فرقہ کی ذہنیت اور اکثریت میں پہنچی ہو۔ بقول ایچ۔ جی۔ ویلز "پارٹی سسٹم طرز حکومت تاریخ سیاست کا سب سے بڑا وہم اور موجودہ ضروریات کیلئے بالکل ناموزوں اور ناکافی ہے۔ اور جو طریقہ کبھی انگلستان قوم کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہو کوئی ضرورت نہیں کہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں وہ طریقِ حکومت موزوں اور منصفانہ ہو"

لیکن بدقسمتی سے کانگریس کی موجودہ ذہنیت بالکل فسطائیت ہو گئی ہے۔ صدر کانگریس پنڈت جواہر لال صاحب ہٹلر اور مسولینی کی طرح کسی دوسری پارٹی کا وجود بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتے خواہ وہ جماعت کانگریس کے ہم مقصد ہی کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ پنڈت جی نے کلکتہ میں فرمایا کہ "ملک میں صرف دو جماعتیں ہیں ایک کانگریس دوسرے انگریز ہر تیسری جماعت کو کسی ایک نہ ایک جماعت میں مدغم ہو جانا چاہیئے"

کانگریس کے مجوزہ صدر مسٹر سبھاش چندر بوس نے اٹلی اور جرمنی کے سفر کے بعد واپسی پر جو بیان دیا تھا وہ پارٹی مطلق العنانی کو کس قدر واضح کر رہا ہے۔ "اتحاد کے غلط خیال کو ہمیں خیرباد کہنا چاہیئے جنگ جیتنے کے بعد سیاسی فتح سے دستبرداری کا کوئی سوال نہیں ہو سکتا ہے۔ کانگریس کی فتح کے بعد کانگریس کو توڑنے کا کوئی سوال نہیں ہو سکتا۔ پارٹی کمیٹی ڈکٹیٹرشپ سوراج کے پہلے اور سوراج کے بعد ہر دو حالتوں میں اب آئندہ کے لئے ہم لوگوں

کا نعرہ اور آواز ہوگا"۔
ہمارے کانگریس زدہ مسلمان اسکو غور سے پڑھیں۔ اور یہ سمجھ کر پڑھیں کہ یہ اس شخص کا بیان ہے جن کو صدر بنانے کے لئے تمام ہندوستان کے ہندو بے چین ہیں یہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے کلکتہ کارپوریشن میں مسلم حقوق کی سخت مخالفت کی تھی اور جس کے جواب میں مسٹر داس نے سوراج پارٹی سے استعفا دینے کی دھمکی دی تھی جنھوں نے ۲۷ء اتحاد کانفرنس کلکتہ کی تجویز کے متعلق گائے کی قربانی کی سخت مخالفت کی تھی۔

لیکن یہ تمام پارٹی کی طاقتیں اور اصول سیاست اور "بلا شرط حوالہ" کی دھمکیاں صرف مسلم لیگ کے لئے ہیں۔ کانگریس نے یو۔پی۔ میں مسلم لیگ کی ایک شرط کو تسلیم نہ کیا اور سرحد میں ڈیماکریٹک اور انڈیپنڈنٹ پارٹیوں کی لیگ سے کہیں زیادہ سخت شرائط کو تسلیم کر کے اور ان دونوں پارٹیوں کے وجود کو قائم رکھ کر وزارت مرتب کر لی اور انھیں اصولوں پر باقی چار مسلم صوبوں کی وزارت پر دانت لگائے ہوئے تھے۔

مولانا آزاد نے اپنے بیان مورخہ یکم اگست میں فرماتے ہیں
"یہ امید کی جاتی تھی کہ اگر ان شرائط پر اتفاق ہو گیا اور مسلم لیگ پارٹی کے ممبران اسمبلی، کانگریس پارٹی کے ممبر بنگئے تو مسلم لیگ پارٹی ایک علیحدہ گروپ کی حیثیت سے ختم ہو جائیگی صوبائی کابینہ وزارت کی ترتیب میں ایسی صورت میں یہ مناسب خیال کیا جاتا تھا کہ ان کو کچھ نمائندگی ملنا چاہیئے"

لیکن اسکے باوجود پنڈت جواہر لال صاحب کی ڈکٹیٹرشپ نے بالکل گوارا نہ کیا کہ وہ جب تک بلا شرط اپنے آپ کو کانگریس پارٹی کے حوالے نہ کر دیں اسوقت تک نمائندگی کا کوئی سوال ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگریس کسی مسلم منظم جماعت کو ایک پارٹی کی شکل میں دیکھنا ہی نہیں چاہتی اسلئے بھی

* بصدارت مجلس استقبالیہ کلکتہ مسلم لیگ کانفرنس از [illegible] حسین صاحب [illegible]

پورے طور سے ہندوؤں کے دستِ کرم میں رہیں۔ ۱۹۳۲ء کے بعد بالخصوص جب مسلم لیگ نے دہلی تجاویز کو منظور کرلیا اور مخلوط انتخاب کو چند شرائط کے ساتھ تسلیم کرلیا تو کانگریس نے ایک قدم اور آگے بڑھا اور خالص مخلوط نہایت بلا تحفظ نشست پر زور دیا۔ یہاں تک کہ نہرو رپورٹ میں اسکو بطور آئیڈیل شامل کرلیا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد سے کانگریس نے اقلیتوں کے وجود سے انکار کرنا شروع کیا۔ پنڈت جواہرلال نے اس قسم کی تقریریں کیں خود گاندھی جی نے گول میز کانفرنس میں فرمایا کہ ہندوستان میں اقلیتوں کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اور ۱۹۳۵ء کے بعد سے کانگریس کے اسی عقیدے نے بالکل فسطائی شکل اختیار کرلی اب نہ صرف اس نے مسئلہ اقلیت کے وجود اور بین الملی مفاہمت کی ضرورت سے انکار کرنا شروع کیا بلکہ قومیت اور اشتراکیت اور سوشلزم کے نام پر اقتصادی پروگرام کی آڑ میں استبدادانہ اور مطلق العنان شکل اختیار کرلی۔ وزارت قبول کرنے کے بعد میں یہ ذہنیت بہت تیزی سے رونما ہو رہی ہے۔ اب نیشنلزم اور قومیت متحدہ "فلارنساوی میکیاولی کے انتہاپسند عقیدے "قومیت پرستی" میں تبدیل ہوتی نظر آرہی ہے۔ جس میں سلطنت اور قومیت ہی Highest good (خیر مطلق) ہے۔ اور ہر دوسری شئی حتی کہ مذہب، اخلاق اور انصاف تک اس پر قربان کیا جاسکتا ہے۔ اسکی رو سے اسٹیٹ اور قومیت حاکمیت مطلق" ہے اور جو "دوسری جماعت غیر مشروط اطاعت سے سرتابی کرے اس کو فنا کر دینا چاہیے" پارٹی ڈکٹیٹرشپ اسی عقیدہ پر مبنی ہے اسی "قومیت پرستی" کے مذہب کو اقبال نے "باطل حق پیرہن" سے تعبیر کیا ہے۔

اسی فتنہ کے خلاف شاعر مشرق علامہ اقبال نے لکھا ہے۔

آدمیت کشتہ شد چوں گوسفند — پیش پائے ایں بتِ نا ارجمند
اے کہ خود دستی ز صنعت نے خلیل — گری خونت ز بتہا نے خلیل

بسرا ایں "باطل حق پیرہن"
[illegible]

یہ اسی باطل حق پیرہن" کا نتیجہ ہے کہ کانگریس بندے ماترم جیسے گیت کو ہر ہندوستانی کے سر منڈھنا چاہتی ہے ترنگے جھنڈے کی عزت ہر شخص سے چاہتی ہے۔ ہر دوسری جماعت کے وجود کو فنا کرنا چاہتی ہے اور اس کو خدائی حق سمجھتی ہے کہ ہر شخص غیر مشروط وفاداری اور اطاعت کرے یہاں تک کہ مذہب اور زبان تک کو خیرباد کہنے کو تیار نہیں ہے۔

بہرحال ان تمام واقعات کو سامنے رکھ کر اگر کانگریس کا جائزہ منصفانہ نظر سے لیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے۔ اسکے دماغ میں "آزادی کامل" کا تخیل تک بھی نہیں ہے جس کی ہندوستان اور اسلام کو ضرورت ہے۔ اس کی تمام سیاسی جد و جہد اور کارروائیوں کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہندوستان میں "قومیت پرستی" کے ذریعہ ہندو کلچر کی اشاعت اور ہندو راج کا استحکام برطانیہ کی فوجی حفاظت کے ماتحت قائم رہے اور اگر ہندو نیشنلزم برٹش امپیریلزم سے آزاد ہونا چاہتی ہے تو خود دوسری غیر ہندو اقوام کے لئے امپیریلزم بننا چاہتی ہے۔ ورنہ جمہوری حکومت کی ایک ذرا سی جھلک میں وہ اتنی سرشار نہ ہو جاتی اور برٹش امپیریلزم کے خلاف متحدہ محاذ اور مسئلہ اقلیت کی اہمیت اور اسکے حل کرنے کے ذرائع کو اس نے پس پشت نہ ڈالتی۔

اقلیت کا مسئلہ صرف ہندوستان ہی میں درپیش نہیں ہے بلکہ دوسرے ممالک میں بھی یہ مسئلہ برابر اہمیت رکھتا ہے۔ یورپ کے کئی ممالک میں بھی جہاں اکثریت اور اقلیت کی تفریق مذہب کی بنا پر نہیں بلکہ جغرافی حدود پر مبنی ہے یہ مسئلہ حائل رہا ہے۔ مگر جن قوموں نے آزادی حاصل کرنے کی خواہش کی ہے۔ انھوں نے اس مسئلہ کے حل میں زیادہ سے زیادہ کوشش کی ہے اور اقلیتوں کو پورا پورا اطمینان دلایا ہے۔ اور تمام قوت باہمی مفاہمت میں ہی صرف کی ہے۔ مصر کی حال ہی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ مصر کی مسلمان اکثریت نے دوسری اقلیتوں سے کس فراخ دلی سے مفاہمت کی ہے اس کے آئین کا ملاحظہ کیجئے۔ وہاں سب سے

پہلے اقلیت کے ہی مسئلہ کو حل کیا گیا ہے۔

سوئیزرلینڈ اور زیکوسلواکیا کی مثالیں ہمارے پیش نظر ہیں وہاں وزارتیں فقط ایک پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ پر بھی نہیں ہیں بلکہ مختلف نسلوں زبانوں اور تمدنوں کو حکومت میں قانوناً نیابت دیجاتی ہے۔ سوئیزرلینڈ میں جرمن ستر فیصدی آباد ہیں۔ اور فرانسیسی اور اطالوی اقلیت میں ہیں مگر دونوں اقلیتوں کو وزارت میں برابر نمائندگی ملتی ہے۔

زیکوسلواکیا میں جرمن آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ میں سے کل مبلغ پچیس لاکھ ہے لیکن اتنی معمولی اقلیت کے حقوق کی ضمانت تحفظات آئین کے ذریعے کی گئی ہے۔ نہ صرف جرمن زبان کو عدالتوں اور دفتروں میں سہولت بہم پہونچائی گئی ہے۔ بلکہ پبلک ٹھیکوں اجارداروں اور ملازمتوں کا ایک خاص حصہ جرمن قوم کے لئے معین کر دیا گیا ہے۔ اور ایک سکریٹریٹ، اور ایک جوائنٹ کیبنٹ مختلف مقامات پر ستر شاخوں کے ساتھ حسب معاہدہ ۱۰ فروری [illegible] قائم کی گئی ہے۔ جو جرمنیوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے تمام ضروری معاملات سے گورنمنٹ کو مطلع کرتی ہیں۔ حالانکہ وہاں آٹھ دس سیاسی پارٹیاں قائم ہیں جن میں پانچ پارٹیاں زیچ اور تین جرمن ہیں مگر وزارت ایک پارٹی کی مطلق العنانی میں مرتب نہیں ہوتی بلکہ کولیشن (وزارت مخلوط) تمام پارٹیوں کے باہمی مفاہمت سے ترتیب دیجاتی ہے

زیکوسلواکیا اور سوئیزرلینڈ کی مثالوں سے ہندوستان کافی سبق حاصل کرسکتا ہے جب ان دونوں یوروپین ممالک میں جو تہذیب اور تمدن میں دوسرے ممالک سے پیچھے نہیں ہیں۔ اقلیتوں کے وجود کو علیحدہ جماعتی حیثیت سے نہ صرف تسلیم کر لیا گیا ہے بلکہ ان کے ساتھ مساویانہ مفاہمت کر کے مخلوط وزارت مرتب کیجاتی ہے اور نہ صرف ملازمتوں میں بلکہ ٹھیکوں اور اجارہ داروں تک میں ان کو پورا حصہ دیا جاتا ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کی اکثریت یعنی کانگریس پارٹی مسلمانوں کی جماعت کے وجود کو تسلیم نہ کرے اور ان سے مساویانہ مفاہمت میں پس وپیش کرے جب مسلم لیگ

اور کانگریس اپنے کریڈ اور پروگرام میں استقدر قریب ہیں۔ تو پھر کیا سبب ہے کہ اس کے ساتھ باعزت سمجھوتہ کر کے مخلوط وزارت مرتب کرنے میں کانگریس اپنی توہین سمجھے

سر ایم این رائے کے خیالات اس مسئلہ میں قابل غور ہیں۔ آپ دنیا کی سیاست میں بین الاقوامی پوزیشن رکھتے ہیں۔ اور کانگریس کے مشہور لیڈر ہیں اور روس میں اسٹالن اور ٹراٹسکی کے ساتھ کام کر چکے ہیں۔ آپنے حال ہی میں اپنا بیان شایع فرمایا ہے۔ جو کلکتہ کے انگریزی اخبار "مسلمان" میں شایع ہوا ہے اور اردو ترجمے مختلف اخبارات میں آچکے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

"فرقہ وارانہ سوال حل ہونا ابھی باقی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کانگریس اس سوال کو آجتک حل کرنے میں ناکام رہی۔ اس مسئلہ کا افسوسناک پہلو تو یہ ہے کہ کانگریس کو جو اعتماد مسلمانوں کا خلافت کے زمانے میں حاصل تھا وہ کھو چکی ہے۔" آگے چل کر آپ نے فرمایا ہے "جمہوری دستور میں بھی اقلیتوں کا اپنے حقوق کے تحفظات کا طلب کرنا قرین العقل ہے سب سے زیادہ مکمل اور جمہوری دستور جو ابتک کبھی ملک میں پیش کیا گیا ہے وہ روس کا ہے لیکن وہاں سب سے پہلے اسی مسئلہ کو حل کیا گیا ہے۔ اس لئے وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم حقائق پر اپنی نظر رکھیں۔ تمام ہندوستان کی آزادی میں مسلمانوں کی اقلیت بہت اہم ہے اور ہندو اکثریت سے اس کا خوف تاریخی شواہد پر مبنی ہے۔ اس خوف کو اعتماد سے بدل دینا اکثریت کا فرض ہے۔ یہ اعتماد ان کے نظریہ کو نفرت اور شبہ سے دیکھنے سے نہیں بلکہ اقلیت کے تحفظات کے منظور کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔"

ہندوستان کی ظالم اور متکبر اکثریت اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت اور ان سے مفاہمت کرنے کا حوصلہ موجودہ اسلامی سلطنتوں سے سیکھے۔ ایران میں اعلیٰحضرت رضا شاہ پہلوی نے نہ صرف پارسیوں کے ہر قسم کے حقوق کی حفاظت کی ہے۔ بلکہ ان کو اپنا علیحدہ قومی نظام قائم کرنے کی اجازت دی ہے۔ حکومت ٹرکی میں عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ جو طرز عمل کیا جا رہا ہے۔ وہ قابل تقلید ہے۔ مصر نے حال میں آئین نو "آزادی کامل" کی شکل میں حاصل کیا ہے اور فراخدلی سے قبطیوں اور یہودی

قلیتوں کو مطمئن کیا ہے۔ وہ ہمارے ملک کی اکثریت کی آنکھ کھولنے کو کافی ہے حکومت عراق نے بھی قلیتوں کو نہایت وسیع ملکی حقوق عطا کئے ہیں اور تمدنی معاشرتی اور زبان کے معاملہ میں ان کو پوری پوری آزادی دی ہے۔

جامعہ قیرو کے ایک قانونی پروفیسر مسٹر بی۔ ایس۔ بکش جنہوں نے حال ہی میں استنبول انگورہ اور بغداد کا سفر ختم کیا ہے اپنے ایک بیان میں فرماتے ہیں۔

"میں اپنے ذاتی شاہدات کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ ٹرکی، مصر اور عراق میں غیر مسلموں کے حقوق بالکل محفوظ ہیں وہاں اقلیتوں کو وہ تمام سیاسی معاشرتی اور مذہبی حقوق حاصل ہیں جو ان کو ہونے چاہئیں یا نکو تمام قانونی اور انتظامی انتخابات میں برابر حصہ دیا جاتا ہے۔ وہاں مجالس آئین ساز میں اقلیتوں کے نمائندوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ جو آبادی کے اعتبار کے تناسب سے ہونی چاہئے

(بحوالہ الامان مورخہ ۱۹۔ نومبر ۳۶ء)

لیکن ہماری نام نہاد قومی جماعت کانگریس بیرون ہند کی ان مثالوں کی تقلید نہیں کرنا چاہتی۔ وہ اگر تقلید کرنا چاہتی ہے تو جرمن اور اٹلی کی جہاں اکثریت کی پارٹی کے خلاف کوئی آواز اٹھانا ناقابل معافی جرم ہے۔ جب اس کے سامنے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے۔ کہ جمہوری حکومت کے جزوی یا کلی حاصل ہو جانے پر وہ مسلمانوں کی جماعت اقلیت کو سیاسی جماعت تسلیم کر کے اس سے مفاہمت کرے اور متحدہ محاذ قائم کرے تو جواب ملتا ہے کہ ہمارے سامنے فرقہ وارانہ سوال در پیش ہی نہیں ہے اگر کوئی سوال ملک میں ہے تو وہ کاشتکاروں اور زمینداروں کا ہے۔

اصل میں یہی مسئلہ ہے جس کی وجہ سے کانگریس اور مسلمانوں کے درمیان زبردست خلیج حائل ہے۔ یہی سبب ہے جسکی بنا پر مسلم لیگ اور کانگریس میں موجودہ کشمکش ہے اور یہی پارٹی ڈکٹیٹرشپ کا بھوت ہے جس نے کانگریس کو اتنا مدہوش بنا دیا ہے کہ وہ اس حقیقت سے بے خبر ہوتے ہوئے کہ اسوقت لیگ ۔۔ اور کانگریس کے پروگرام اور کریڈ میں کوئی فرق نہیں ہے لیگ نے کانگریس کے کسی مفید پروگرام کی

مخالفت آجتک نہیں کی لیگ میں زبردست اکثریت قوم پرور طبقہ کی ہے، الیکشن کے زمانے میں لیگ اور کانگریس میں کوئی اختلاف رائے نہ تھا مگر ان سب واقعات کے باوجود وہ مسلمانوں سے مساویانہ مفاہمت کرنے کو تیار نہیں۔ کبھی وہ مسلم لیگ کو اپنی طاقت کے نشہ میں رجعت پسند جماعت کہتی ہے اور حسرت موہانی اور ظفر علیخاں جیسے اکثریت رکھنے والے قوم پرور مسلمانوں کو غلامی کا علمبردار بناتی ہے۔ کبھی چند مسلمان جو کانگریس کے ہاتھ آلہ کار ہیں۔ انکے اشارے پر فرقہ وارانہ مفاہمت کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور جناح اور لیگ پر یہ الزام رکھتے ہیں کہ وہ اپنے مطالبات کی فہرست پیش نہیں کرتے۔

لیکن ان حضرات کو جواب دینا محض حماقت ہے۔ مسٹر آصف علی اور سید محمود سے زیادہ جواہرلال صاحب خود جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے مطالبات کیا ہیں۔ تمام افتراق صرف اس بنا پر ہے کہ مسلمان چاہتے ہیں کہ کانگریس "پارٹی ڈکٹیٹرشپ" کے اصول کو ترک کر کے مسلمانوں کی علیحدہ جماعت کے وجود کو تسلیم کرے۔ وہ جماعت برٹش امپیریلزم کے خلاف اور آزادی ہند کی ہر تحریک میں کانگریس سے اشتراک عمل کرنے کو تیار ہے اس لئے اس کو قلیت کی علیحدہ جماعت مانتے ہوئے اس سے مساویانہ مفاہمت کیجاوے خواہ جنگ کو یا جمہوری حکومت جزوی یا کلی ملک میں نافذ ہو کانگریس اس جماعت کو اپنے ساتھ لیکر متحدہ محاذ قائم کرلے اگر کانگریس وزارت مرتب کرے تو اس جماعت کے ساتھ مخلوط وزارت بنائے۔ اور جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں وہ جماعت بھی کانگریس کو انہیں شرائط پر اپنے ساتھ ملانے پر تیار ہے لیکن کانگریس اس کو بھی اپنی توہین سمجھتی ہے۔

یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے کانگریس کے سامنے کوئی سوال مذہبی اور فرقہ وارانہ حیثیت کا نہ ہو اور وہ خالص اقتصادی مسئلہ پر سیاسی حیثیت سے تمام توجہ صرف کرنا چاہتی ہو۔ مگر یہ غلط فہمی بھی دور ہو جاتی ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جہاں مسلمانوں کی

اقلیت ہے وہاں اس قسم کے سوالات درپیش نہیں ہوتے مگر جہاں ہندو اقلیت میں ہیں وہاں اقلیت کا مسئلہ وہی صورت اختیار کرتا ہے جس کو مسلمان چاہتے ہیں۔ یو۔ پی۔ میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ مگر ان کی صرف ایک شرط کو بھی نامنظور کر دیا ان سے کہیں زیادہ شرائط سرحد میں ہندوؤں کی تسلیم کر لی گئیں۔ اس لئے کہ وہاں ہندوؤں کی اقلیت ہے۔ یہ ہے کانگریس کی وہ ذہنیت جس کا دعوے یہ ہے کہ مذہبی مسائل اس کے سامنے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے۔

اچھا اگر یہ واقعہ ہے تو پھر کانگریس کے بڑے بڑے رہنما کیوں چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر اتنی توجہ صرف کرتے ہیں۔ جب کوئی معاملہ ان کے مذہب کے متعلق آکر پڑتا ہے۔

لاہور میں جو بوچڑ خانہ تعمیر ہو رہا تھا۔ اس کے سلسلہ میں حال ہی میں جو طرز عمل کانگریس کے لیڈروں نے اختیار کیا وہ ان کی تنگ نظری اور مذہبی جوش اور ہندو سبھایانہ تعصب ظاہر کرتا ہے گاندھی کا یہ تار کیا ظاہر کرتا ہے جو انھوں نے لالہ دیش بندھو گپتا کے نام ارسال فرمایا ہے جو کہ دہلی کانگریس کے سرگرم رکن اور کانگریس کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر پنجاب اسمبلی میں پہنچ گئے ہیں: "میں یقیناً لاہور چھاؤنی میں بوچڑ خانے کھولنے کے خلاف ہوں جیسا کہ میں دوسرے بوچڑ خانوں کے خلاف ہوں۔"

پنڈت جواہر لال نہرو صاحب جو مذہب کے نام سے بھی گھبرا لیتے ہیں جب مسلمانوں کی زبان سے لیا جاتا ہے "اسی بوچڑ خانے کے متعلق ایک تار میں ارشاد فرماتے ہیں۔ "میں بوچڑ خانوں کو پسند نہیں کرتا اور ان کے قریب جاتا ہوا گھبراتا ہوں جو لوگ بوچڑ خانوں سے دہشت زدہ ہوتے ہیں۔ ان کی حمایت کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ایسے معاملات میں جس علاقہ کے باشندوں کی رائے کو سب سے زیادہ وقعت حاصل ہونا چاہئے۔ اگر وہ اس پر سختی کے ساتھ معترض ہوں تو حکام متعلقہ کو ان کے جذبات کی قدر کرنی چاہئے۔"

جو صاحب پنڈت جواہر لال نہرو کی رواداری پر قربان ہیں وہ اب ماتم کریں اپنی

حالت پر کہ باوجود اس کے کہ پنڈت جی کا دعویٰ ہے کہ ان کے سامنے فرقہ وارانہ کوئی مسئلہ ہی نہیں پیش آتا اور بوچڑ خانہ جیسی معمولی تحریک سے وہ بقدر متاثر ہو جاتے ہیں اور لاکھوں مسلمان قصائیوں کی بیروزگاری کا بھی ان کو خیال نہیں آتا۔

گر ہمیں مکتب است و ایں ملا
کار طفلاں تمام خواہد شد

ایک سوال باقی رہ جاتا ہے جو مسلمان عوام کو بعض اوقات ایک فریب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ وہ یہ کہ کانگریس کی کراچی اور بعض دوسری قراردادوں میں اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کا یقین دلایا گیا ہے پھر مسلمان اقلیت کانگریس سے کیوں بیزار ہے یہی جواب اکثر ہمارے کانگریسی مسلمان جن کی ذہنیتیں کانگریس کی طاقت سے مرعوب ہو چکی ہیں۔ دیا کرتے ہیں لیکن ان کو نہیں معلوم کہ مسلمانوں نے کبھی کانگریس یا کسی دوسری حکومت سے اپنے مذہبی یا سیاسی حقوق کی حفاظت کی بھیک نہیں مانگی ہے کانگریس کے اس قسم کے اعلانات بالکل اس قسم کے ہیں جیسے کوئی فاتح حکمران کسی شکست خوردہ اور مفتوح قوم کے سامنے پیش کیا کرتا ہے اس سے زیادہ تحفظات حقوق کے اعلانات تو اٹلی کی طرف سے اہل حبش کے لئے کئے جا چکے ہیں خود سلطنت برطانیہ اس قسم کے سیاسی اعلانات آئے دن کرتی رہتی ہے مگر اس قسم کے اعلانات میں وہ مساویانہ مفاہمت کی بو کہاں ہے۔ جو مسلمانوں کا مطالبہ ہے جس کی مثالیں اوپر دی جا چکی ہیں۔ ان اعلانات کا مطلب تو صرف اتنا ہے کہ جب ہندوستان میں ہندو اکثریت کی حکومت ہوگی تو اقلیتوں کو جو ان کی مفتوح رعایا ہوگی۔ یہ اطمینان دیدیا جائیگا کہ وہ ان کی حراست اور حفاظت میں مذہبی معاملات میں آزاد ہیں۔ لیکن مسلمان اس قسم کے اعلانات پر صرف اس وقت قناعت کرنے پر مجبور ہونگے۔ جب بدقسمتی سے خدانخواستہ ان کے سیاسی وجود کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اور ان کے اندر کوئی طاقت باقی نہ رہے گی ورنہ جب تک مسلمان اس ملک میں "مساوی شریک حکومت جمہوریت" ہونے کی طاقت رکھتے ہیں اور ان کا یہ مطالبہ قائم ہے اس قسم کے اعلانات ان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے۔

لالہ ہردیال ایم اے جو ایک مشہور سنگھٹی ہیں کا مشہور بیان مورخہ ۲۰ مئی ۱۹۳۶ء مطلب بظاہر مضحکہ خیز ہے۔ لیکن موجودہ کانگریس کی پالیسی کی اصل تصویر ہے۔ آپ نے اس میں فرمایا تھا کہ۔

"انگریز ہندوؤں سے عہد و پیمان کرنے کے بعد" ۹۵ فیصدی سوراجیہ" دیدے یا آزاد ہندو ریاست" قائم ہو جاسکیا جب ہندو سنگٹھن کی طاقت سے سوراجیہ ملنے کا وقت قریب آجائے تو ہماری نیتی (پالیسی) عیسائیوں اور مسلمانوں کی طرف جو ہوگی اس کا اعلان کر دیا جائیگا۔ اس وقت باہمی سمجھوتے کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ ہندو مہاسبھا صرف اپنے فیصلہ کا اعلان کریگی کہ نئی" ہندو ریاست" میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے کیا فرائض۔ اور حقوق ہونگے"۔

ان سے زیادہ صحیح اور صاف الفاظ میں موجودہ کانگریس کی پالیسی کی تصویر نہیں کھینچی جا سکتی کانگریس ۹۵ فیصدی سے زیادہ "سوراجیہ" کی خواہاں کبھی نہیں ہے اور اس میں "آزاد ہندو ریاست" کی متمنی ہے" باہمی سمجھوتے" کی واقعی اس کو ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمام پالیسی ہندو مہاسبھا کے طرز عمل پہ قائم کرنا چاہتی ہے۔ جس کا تازہ ترین ثبوت بھائی پرمانند کی وہ تحریر ہے جو آپ نے پنڈت جواہر لال صاحب کی خدمت میں حال ہی میں ارسال کی ہے اس کا مندرجہ ذیل ایک اقتباس راغب حسین صاحب کے خطبہ صدارت صفحہ [illegible] مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۳۶ء میں ہے۔ ذیل میں درج کرتا ہوں۔

"یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آج کانگریس بھی ہندو مہاسبھا کے اس اصول کا اقرار کر رہی ہے کہ نہ کوئی مسئلہ اقلیات ہے اور نہ اس کے حل کرنے کی ضرورت ہے۔ نہ کوئی فرقہ وارانہ مسئلہ ہے اور نہ فرقہ وار مفاہمت اور معاہدہ کی ضرورت ہے"۔

کاش ان تمام واقعات سے اب بھی مسلمان کلیتہً آگاہ ہو جائیں!۔

کمیونل ایوارڈ اور کانگریس

کمیونل ایوارڈ اس فرقہ وارانہ تقسیم کا نام ہے۔ جس کی رو سے مسلم اور غیر مسلم اقوام کی علیحدہ علیحدہ نشستیں مختلف صوبوں میں مقرر کر دی گئی ہیں۔ گول میز کانفرنس میں کانگریس کے ہندو لیڈروں کی تنگ نظریوں کی بنا پر ہندو مسلمان کوئی فرقہ وارانہ سمجھوتہ نہیں کر سکے تھے۔ گاندھی جی نے تو یکسر فرقہ وارانہ مسئلہ کے وجود ہی سے صاف انکار کر دیا تھا۔ کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ سوال کا وجود ہی نہیں ہے جس پر مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے جواب دیا تھا کہ "ہمت کے ساتھ حقائق کا سامنا کیجئے فرقہ وارانہ مسئلہ ایک مسلمہ حقیقت ہے"۔ گاندھی جی بعد میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب پر راضی ہوئے مگر ایک خود غرض شرط کے ساتھ کہ اچھوتوں کو ہندوؤں سے الگ نہ کیا جاوے اور ان کو جداگانہ حق انتخاب نہ دیا جاوے۔ اگرچہ اسمیں مسلمانوں کا فائدہ تھا۔ کیونکہ ایسی صورت میں مسلمانوں کے بیچ میں ایک اور زبردست اقلیت آحائل ہوتی مگر انہوں نے اس کو تسلیم کرنے میں اپنی خود غرضی سمجھی۔ پھر سر علی امام مرحوم نے جب گاندھی جی سے سوال کیا کہ کیا آپ مسلمانوں کا مطالبہ کانگریس کی طرف سے منظور کرتے ہیں۔ یا ذاتی حیثیت سے تو گاندھی جی نے جواب دیا کہ "میں ذمہ دار نہیں ہوں کہ کانگریس تسلیم کرے گی۔ میں کوشش کروں گا"۔

پھر خود مہاتما گاندھی کے علاوہ دوسرے گیارہ لیڈروں کی درخواست پر مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کو ثالث مقرر کیا گیا کہ وہ اس فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل کر دیں مسلمان اس درخواست کے بالکل ساتھ نہ تھے اور ان کی یہی کوشش تھی کہ اگر آپس میں ہی کوئی فیصلہ ہو جاوے تو زیادہ اچھا ہے۔ اس تقسیم کی رو سے بعض صوبوں میں مسلمانوں کو ان کے مطالبہ کے مطابق ہندوؤں کی خواہش سے کچھ زیادہ سیٹیں مل گئیں۔ مثلاً۔ یوپی میں مسلمان چودہ فی صدی تھے مگر اس کی رو سے ان کو ۳۰ فیصدی نشستیں مل گئیں۔ اگرچہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے بہت کم دی گئیں صرف اس کے لئے کہ مسلمانوں کو چند صوبوں میں کچھ زیادہ حصہ مل گیا۔ ہندوستان کے ہر خیال کے ہندو نے خواہ وہ

مہاسبھائی ہو یا کانگریسی اس تقسیم کی سخت مخالفت کی۔ وہ ہرگز گوارا نہ کر سکے کہ مسلمانوں کو ذرا بھی ان کی خواہش سے زائد مل جائے۔ حالانکہ غور کرنے کی بات ہے کہ اگر مسلمانوں کو کچھ زیادہ نشستیں مل بھی گئیں تو ان کی اکثریت پر کیا اثر پڑنا چاہیے تو یہ تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کی غرض سے اور آزادی کو قریب تر لانے کے لئے بغیر کسی ثالث کے ہی خود مسلمانوں کے مطالبے اور زیادہ منظور کر لیتے لیکن انکے نزدیک تمام پنجابی ہندوؤں کے حقوق کی پرواہ کو گوارا کر سکتے ہیں وہ نشستیں بھی کو جو مسلمانوں کو زیادہ نہ ملے۔ کانگریس کا طرز عمل تو صاف یہ ہونا چاہیے تھا کہ اس ایوارڈ کو فوراً منظور کر لیتی تاکہ مسلمانوں کو کوئی شکایت باقی نہ رہتی مگر اس نے ہندوؤں کو ناراض نہ کرنے کے لئے اس کو نہ منظور کیا نہ مسترد۔ اس لئے نہیں کیا کہ مسلمانوں کی تسلی کم از کم اسی طرح رہے مگر یہ بات بھی برادران وطن کو کب بھا سکتی تھی انھوں نے تمام قوت اس کی مخالفت میں صرف کر دی۔ مالویہ جی نے اپنی پارٹی بھی ایک بنالی انھوں نے کانگریس کی کھلم کھلا مخالفت کی۔ بنگال میں سرت چندر بوس کی سرکردگی میں اور پنجاب میں ڈاکٹر ستیہ پال اور دوسرے کانگریسی لیڈروں کی رہنمائی میں لاکھوں ہندوؤں کے دستخط کرا کر وزیر ہند کے پاس میموریل روانہ کیے گئے۔ کہ ہندوؤں کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ اب جب الیکشن کا زمانہ آیا تو کانگریس نے اپنا طرز عمل بدلا جب تک تو غیر جانب دار تھی مگر اب اس نے صاف اعلان کر دیا کہ وہ بھی اس اعلان تقسیم کو بالکل ناپسند کرتی ہے۔ لہذا الیکشن مینی فسٹو میں صاف صاف مندرجہ ذیل الفاظ میں اعلان کیا: "کلی طور پر دستور سے قطع نظر کمیونل ایوارڈ قطعاً اس قابل نہیں ہے کہ اس کو منظور کیا جائے۔ کانگریس کی روش لاپرواہی اور غیر جانبداری کی نہیں ہے۔ وہ شدت سے فرقہ وارانہ فیصلے کو نامنظور کرتی ہے۔ اور اسکو ختم کر دینا چاہتی ہے۔"

اس سے کانگریس کی ذہنیت کس قدر جانے لگی ہے کہ وہ ایک انچ بھی مسلمانوں کے لئے بڑھنے کو تیار نہیں ہے۔ وہ ہرگز چاہتی ہی نہیں کہ باعث عزت سمجھوتہ ان سے کیا جائے اس پست ذہنیت کو بعض ہندو لیڈران خود تسلیم کرتے ہیں۔ لہذا مسٹر ایم

این رائے نے آخر جولائی یا ابتدائے اگست میں جو تقریر مدراس میں ہندوؤں کے مجمع میں کی وہ ایسٹرن ٹائمز میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں انھوں نے کانگریس کی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

"اسوقت مسلمانوں کی کانگریس سے فوری علیحدگی کی وجہ یہ ہے کہ کانگریس کی فضا ہندویت سے معمور ہے جسطرح مذہبی ہندو ہر ایسی تحریک میں شریک ہونے سے انکار کریں گے جس میں اسلامیت بھری ہو اسی طرح مسلمان بھی اس قومی تحریک میں شرکت سے علیحدہ ہیں۔ اس لئے کہ اس تحریک میں ہندوؤں کو زیادہ اقتدار حاصل ہے۔ ہندو قوم پرستوں کا فرض ہے کہ وہ اس بات میں پہل کریں اور اکثریت والی قوم آگے بڑھ کر ایسا اعلان کرے جو مسلمان بھائیوں کو مطمئن کر دے۔"

لیکن مسٹر ایم۔ این رائے کی بات کو گاندھی اور مالویہ کی تنگ نظری کے سامنے کہاں رسائی ہے۔

کانگریس اور گئو رکھشا

جو قوم آزادی کی جدوجہد میں معروف ہو جسکا آخری نصب العین ہی یہ ہو کہ کسی طرح وطن بیرونی تسلط سے آزاد ہو۔ اور جس کا یہ دعویٰ ہو کہ ان کے سامنے مذہب کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے کیا وہ اپنی قوت فکر کو ایک لمحہ کے لئے بھی اردو ہندی اور گئو رکھشا جیسے پست مسائل پر ضائع کر سکتی ہے اور بالخصوص جب کہ ایسے واقعات سے اثر کر دہ ہندوستانی [illegible] ہوں گاؤ کشی کے خلاف کانگریس کے زعماء نے ہمیشہ آواز بلند کی اور اس کیلئے نئی نئی اسکیمیں تیار کیجا رہی ہیں کہ کسی طرح گئو کشی ہندوستان میں بالکل بند ہو جائے بدقسمتی یہ ہے کہ بھائی پرمانند سے لے کر گاندھی جی تک گائے کو مقدس ترین شے سمجھتے ہیں۔ اور وہ مسلمانوں کے خون سے زیادہ گائے کی عزت کرتے ہیں۔ ان کو اس کی پروا نہیں کہ مسلمان پھر بھی انسان ہے اور گائے جانور ہے۔ کانگریس حکومت کے سرآرا ہوتے ہی سب سے پہلے مدراس اسمبلی میں گاؤ کشی کے خلاف بل پیش کرنے کا نوٹس دیا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ ہر وہ شخص جو گائے یا بچھڑے کو ذبح کرے یا ذبح کرنے کی ترغیب دے وہ مجرم ہوگا اور اس جرم کی سزا پچاس روپیہ جرمانہ یا پندرہ دن کی قید محض ہوگی۔

مگر جب تمام ہندوستان میں شور مچا اور جمعیۃ العلماء کے سکریٹری نے تار دیا تو بل واپس لے لیا گیا۔ لیکن کوشش برابر جاری رہی۔ لہذا آخر اگست میں مشہور کانگریسیوں کے ایک وفد نے گاندھی جی سے واردھا میں اور جواہر لال اور راجندر پرشاد اور پٹیل سے ملاقات کی اور گئو رکھشا کے متعلق مشورہ کیا جس پر ان آزادی کے رہنماؤں نے ان کی زبان بند نہیں کی نہ ان کو اسی طرح نصیحت کی کہ ان چھوٹے چھوٹے معاملات میں پڑکر آزادی کی منزل دور مت کرو جس طرح شہید گنج کی مسجد کو شہید ہوتے وقت جواہر لال نے فرمایا تھا کہ یہ بہت معمولی معاملات ہیں ان مسائل پر غور کرنے کا موقع نہیں

مگر اس وقت گئو رکھشا کا مسئلہ تھا انھوں نے متفقہ طور سے وفد سے وعدہ کیا کہ وہ پوری توجہ اس مسئلہ پر صرف کریں گے

بمبئی کے مشہور وزیر مسٹر منشی نے مہاتما جی سے اس کے دو ہفتے بعد ملاقات کی اور انھوں نے بھی اس مسئلہ کی طرف گاندھی جی کی توجہ دلائی۔ گاندھی جی نے وعدہ کیا کہ وہ کوئی صورت ایسی ضرور نکالیں گے۔

ابھی حال میں بنارس کے اندر مسلمانوں کو گئو کشی سے کتنا روکا گیا اور جواہر لال کے تار اور بیان سے خود معلوم ہوتا ہے کہ انکی نیت بالکل بند کرا دینے کی ہے۔

صوبہ پنجاب کی کانگریس کمیٹی کے صدر صاحب ڈاکٹر ستیہ پال کے مندرجہ ذیل خوش کن الفاظ ہندو مہا سبھائی نہیں بلکہ کانگریس کی ذہنیت کے آئینہ دار ہیں اسلئے کہ انھوں نے یہ الفاظ ایک بیان میں تحریر فرمائے ہیں جو بحیثیت کانگریس کے صدر کے ۵-۷- اگست کو شائع فرمایا تھا ان کا پورا بیان ۲۹- اگست کے [illegible] میں ہے وہ الفاظ یہ ہیں:-

کانگریس گوارا نہیں کر سکتی کہ کسی جماعت کے مذہبی جذبات میں ٹھیس لگے کیونکہ یہ بات مصدقہ ہے کہ ہندوؤں کے لئے گائے واجب الاحترام ہے اس لئے کانگریس برداشت نہیں کر سکتی کہ کھلے بندوں ایسا کام جاری ہو جس سے ہندوؤں کو نقصان پہونچے۔

اس بیان کو پڑھ کر اندازہ کیجیے کہ کانگریس یہ کہنے میں کہاں تک حق بجانب ہے کہ وہ آزادی کے راستہ میں مذہب کی تفریق ہی نہیں کرتی۔

اور بہت سے بیانات اس سے زیادہ پریشانی پیدا کرنے والے ہیں بالخصوص متھرا کے سکریٹری ہندو مہاسبھا اور تیج اخبار کے مقالے ہیں جن میں بہت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ کانگریس اور ہندو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے کہ گاؤ کشی کانگریس کی توجہ ابتک اس مسئلہ پر صرف ہو رہی ہے۔ لہذا ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپل بورڈوں میں مخلوط انتخابات رائج کرانے کی اسکیم گاؤ کشی بند کرنے کے لئے بہترین حربہ ہے

غرض یہ کہ مسلمانوں کے لئے گاؤ کشی فرض نہیں ہے مگر مولانا حسین احمد صاحب

کے قول کے مطابق جب کوئی حکومت زبردستی اپنی طاقت سے کسی ایسے کام کو منع کرتی ہے۔ جس کو مذہب نے حلال کیا ہے تو وہ فرض ہو جاتا ہے اور ایسی صورت میں گائے کا ذبح نہ کرنا گناہ ہو جاتا ہے۔ برادران وطن کو خوب معلوم ہے کہ اگر گاؤ کشی بند کر دی جائے تو ہندوستان کی تمام سرزمین بھی چارہ کے لیے ناکافی ثابت ہوگی اور نسل اس قدر بڑھ جائے گی کہ ہندوؤں کو خود گاؤ کشی کرنی پڑے گی۔ جس طرح ضلع فتحپور میں خود ہندوؤں کو درخواست دینی پڑی تھی کہ یہاں گائیں اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ کھیتی اجاڑ ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ انسداد گاؤ کشی سے اقتصادی نقصان کتنا بڑا ہے۔ کتنی بڑی صنعت جو گائے کی کھال اور ہڈیوں سے جاری ہے بند ہو جائے گی۔ گاندھی جی نے گاؤ کشی کا ذمہ دار زیادہ تر ہندوؤں کو ہی ٹھہرایا ہے انھوں نے لکھا ہے کہ ہندوؤں کو چاہیے کہ گائیں خود خرید کر پالیں اور مسلمانوں کے ہاتھ ہرگز فروخت نہ کریں۔ گاندھی جی کی ہندو ذہنیت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ محمد علی مرحوم نے ان کی یہ ذہنیت آزاد کانفرنس میں تحریر کیا تھا کہ "ایک ترین مسلمان کا دل گاندھی جی سے بہتر ہوتا ہے"۔ اس پر ہندو طبقہ بہت بگڑا تھا۔

ذبیحہ گاؤ مسلمانوں کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ شاہان سلف کے زمانے میں قربانی اور روزانہ استعمال کے لیے برابر گاؤ کشی ہوتی تھی۔ غدر کے بعد تک کبھی "گاؤ کشی" کے مسئلے نے فرقہ وارانہ حیثیت اختیار نہیں کی انیسویں صدی کے آخر سے جب ہندوؤں نے اپنی تنظیم کرنی شروع کی تو اس قسم کے خیالات پیدا ہوئے۔ اور جب تحریک خلافت کے بعد سوامی شردھانند نے شدھی اور سنگٹھن کی تحریک شروع کی تو "گاؤ کشی" کے مسئلے کو صرف مسلمانوں سے تصادم پیدا کرنے کے لیے پیدا کیا گیا۔ باوجودیکہ گائے کی عزت ہندو برابر کرتے تھے لیکن شردھانند کی تحریروں اور سوامی دیانند صاحبان سے پیشتر اس مسئلہ کو کوئی اہمیت نہ تھی۔ اسی زمانے میں گؤشالاؤں کی بنیادیں ڈالی گئیں۔

مہاشے کرشن بی اے ایڈیٹر پرکاش کا مندرجہ ذیل مضمون اس

خیال کی پوری تائید کرتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔

"گؤ رکھشا کے سوال کا آریہ سماج کے ساتھ بہت سمبندھ ہے۔ گؤ رکھشا پر سب سے پہلے لیکچر رشی دیانند جی نے دئے تھے اور آج جو گؤشالائیں نظر آتی ہیں۔ یہ سب اسی آواز کا نتیجہ ہیں۔ رشی دیانند نے صرف لیکچروں میں ہی گؤ رکھشا پر زور نہیں دیا بلکہ اس مضمون پر ایک پمفلٹ تیار کی اور اس سے بھی ادھک وہ یہ کوشش کرنا چاہتے تھے کہ بھارت سے گؤ کشی قانوناً بند کر دی جائے"

یہ اقبالی بیان خود اس امر کا شاہد ہے کہ اگر دیانند اس مسئلہ کو نہ اٹھاتے تو ملک کی فضا اس سوال کی وجہ سے اتنی مکدر نہ ہوتی۔ پھر بھی کانگریس حضرات شردھانند اور دیانند کو خادمان کانگریس تسلیم کرتے ہیں اور ان کی خدمات کی تعریف میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں علاوہ مندرجہ بالا بیان کے اور متعدد تاریخی شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جن سے ثابت ہے کہ گاؤ کشی کا مسئلہ ہندو مذہب کا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ ایک سیاسی حربہ ہے پنڈت اناس چندر داس صاحب ایم اے اپنی تصنیف "رگ ویدک انڈیا" طبع دوم ۱۹۲۷ء میں فرماتے ہیں "قدیم آریوں کے یہاں گائے کا گوشت کھانے کی شہادت پائی جاتی ہے۔ لیکن دودھ دینے والی گائیں شاذ و نادر ہی ماری جاتی تھیں"

شری چشامن راؤ ویدجی فرماتے ہیں۔ "زمانہ قدیم میں رشی لوگ گائے کے گوشت کا استعمال کرتے تھے" گو یہ مصنف پنڈت دامودر ساتولیکر جی صرف ایسی تاریخی شواہد سے نہیں۔ بلکہ بہت سے ویدک منتروں سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچی ہے۔ اتھروید کانڈ نمبر ۹ سرکت ۴ نویں منتر میں لکھا ہے۔

"اتیدوا اشوا دیو یہ آدجی گوم۔ کشیرم وا انسم وا تدا بدا شنیات۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "اہل خانہ گائے کا شیریں دودھ اور لذیذ گوشت مہمان کو کھلائے بغیر نہ کھائے"

مسلمانوں کے ہندوستان کے آجانے کے بعد گئو رکھشا کے خیالات ہندوؤں میں پیدا ہوئے مگر وہ ہندو برہمنوں کا مسلمان بادشاہوں کے خلاف ہندوؤں کے دلوں نفرت پیدا کرنے کا ایک سیاسی آلہ تھا غدر کے بعد تک اس مسئلہ نے فرقہ وارانہ حیثیت اختیار نہ کی تھی یہ سوامی دیانند وغیرہ کی تحریکوں کا نتیجہ ہے۔

اس کے بعد سے متواتر کوششیں ذبیحہ گاؤ کو بند کرنے کے لیے کی گئیں۔ عید الضحیٰ کے اکثر موقعوں پر مسلمانوں کو گائے کی قربانی سے روکا گیا اور متعدد مقامات پر مسلمانوں کے خون بہائے گئے۔ یہاں تک خود گاندھی جی نے ایک مضمون میں فرمایا۔

"یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ یورپین کے لئے گاؤ کشی جاری رہنے کے بابت ہندو کچھ بھی محسوس نہیں کرتے میں جانتا ہوں کہ ان کا غصہ اس خوف کے نیچے دب رہا ہے۔ جو انگریزی عملداری نے پیدا کر رکھا ہے۔ مگر ایک ہندو بھی ہندوستان کے طول و عرض میں ایسا نہیں ہے جو ایک دن اپنی سرزمین کو گاؤ کشی سے آزاد کرانے کی امید نہ رکھتا ہو اور ہندو مذہب کو جیسا کہ میں جانتا ہوں اس کی روح کے سراسر خلاف عیسائی یا مسلمان کو بزور شمشیر بھی گاؤ کشی چھوڑنے پر مجبور کرنے سے وہ اغماض نہ کریگا"۱؎ اس مسئلہ کو اتنی اہمیت دی گئی کہ گئو کشی "سوراجیہ" کا ایک جزو بنگیا۔ حقیقت یہی ہے۔ کہ گاؤ کشی اور ہندی پرچار وغیرہ ہی کانگریس کا نصب العین ہے ورنہ سوراجیہ کے اس سے زیادہ اور کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔

اسکے متعدد ثبوت پیش کیے جا سکتے ہیں تقریب قریب ہر کانگریس کے بڑے سے بڑے لیڈر نے سوراجیہ اور "گئو رکھشا" کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے لالہ لاجپت رائے جو کانگریس کے بہت بڑے لیڈر تھے ناگپور میں سنہ ۲۱ء گائے کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

۱؎ بحوالہ اخبار اسٹیٹسمین الفضل ۹ مارچ سنہ ۱۸ء

گائے کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"جب تک سوراجیہ حاصل نہیں ہوتا۔ تب تک گئو رکھشا کا سوال طے نہیں ہو سکتا۔"

مالویہ جی فرماتے ہیں "اہل برطانیہ نے ہندوستان میں کئی غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے ان میں ایک غلطی یہ بھی ہے کہ انھوں نے گائے کے ذبح کو جاری رکھا۔ آپ نے ہر ہندو کو تاکید کی کہ وہ سوراج حاصل کرنے کی کوشش کریں تاکہ وہ گاؤ کشی بند کرانے کے قابل ہو جائیں"۱؎

یہ ہے وہ سوراجیہ کا تخیل جو کانگریسی حضرات کے سامنے ہے اور پھر بھی مسلمان فرقہ پرور کہلاتے ہیں اور ہندو قوم پرست کہلاتے ہیں۔ اے تفو بر تو اے چرخ گردان تفو!

کانگریس اور ہندی زبان

اردو کو فنا کرنے اور ہندی کی اشاعت کی منظم کوششیں غدر کے فوراً بعد ہی شروع ہو گئی تھیں۔ حالی مرحوم فرماتے ہیں۔

"سنہ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں کوشش کیجائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان رائج ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے"

اسکے بعد کوشش برابر جاری رہی یہاں تک کہ سنہ ۱۹۰۰ء میں سر انٹونی میکڈانلڈ کی زیر حمایت ناگری خط یوپی کی عدالتوں میں جاری کر دیا گیا۔ اور اردو ہندی کی باہمی مخالفت کا بیج سرکاری طور سے ڈالدیا گیا۔ جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔ جب غرضیکہ کوششیں برابر جاری رہیں مگر اب کانگریس کا ہر لیڈر مختلف طریقوں سے کھلم کھلا اردو کی مخالفت میں مصروف ہے۔

مالویہ اور گاندھی سے لے کر راجندر پرشاد اور جواہرلال صاحب کی تمام کوششیں

۱؎ انقلاب ۱۸ جون سنہ ۲۹ء

ہندی کی اشاعت اور اردو کو فنا کرنے میں صرف ہو رہی ہیں کانگریس کے جلاس کا تمام کام اور دوسرے اعلانات سب ہندی میں ہوتے ہیں۔ حالانکہ ملک میں اردو دان کی تعداد ہندی والوں سے کہیں زیادہ ہے۔ خود پنڈت جواہر لال نہرو جناب اردو خوب جانتے ہیں اور ہندی بہت کم جانتے ہیں بلکہ ان کو ہندی بولنے میں تکلف ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود لکھنؤ کانگریس کی صدارت کرتے ہوئے جو تقریر صدارت انہوں نے کی تھی اس جلسہ میں خود میں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر سخت حیرت ہو رہی تھی کہ وہ زبردستی ایسے ہندی کے الفاظ قصداً یاد کر کے بول رہے تھے کہ تین چوتھائی آدمی سمجھنے سے قاصر تھے مگر بہرحال یہ ان کی ہندی زبان کے ساتھ ایک زبردست خدمت تھی۔

گاندھی جی سے جب کبھی بھی سوال کیا جاتا ہے کہ آپ ہندی کے اوپر اتنا زور کیوں دیتے ہیں تو وہ تاویلات پیش کرتے ہیں کہ میرا مطلب ہندی سے ہندی اور اردو دونوں میں۔ کانگریس نے اس مسئلہ پر ایک مفصل رسالہ "گاندھی جی اور اردو" کے نام سے عوام کو بہکانے کے لئے نکالا ہے اور مسلم عوام کو بہکانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مہاتما جی اردو کے خلاف نہیں ہیں بلکہ ہندی سے مطلب ان کا اردو بھی ہے مگر آخر میں وہ بھی اس حقیقت کو نہ چھپا سکے۔ لاکھ چھپانا چاہا مگر حقیقت سامنے آ ہی گئی لکھا ہے

"ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ مہاتما جی نے سمیلن کے اجلاس میں ہندی رسم الخط کو اردو پر ترجیح دی مگر یہ رائے رکھنے کا موصوف کو پورا حق ہے انہوں نے فرمایا ہے کہ "میرے نزدیک اردو اور رومن دونوں خطوں میں دیوناگری خط جیسی صوتی صلاحیت اور جامعیت نہیں ہے۔"

صرف یہیں تک نہیں بلکہ ۲۴ اور ۲۵ اپریل ۱۹۳۶ء میں جو اجلاس بھارتیہ ساہتیہ پریشد ناگپور میں ہوا اس میں گاندھی جی نے وہ الفاظ ہندی کی حمایت کرتے ہوئے فرمائے جن کو سن کر سخت افسوس ہوتا ہے۔ اس اجلاس میں بہت سے مسلمان بھی تھے جن میں حضرات مولانا عبدالحق صاحب سکریٹری تبلیغ اردو حیدر آباد

بھی شامل تھے۔ گاندھی جی یہ رزولیوشن پاس کرنا چاہتے تھے کہ ہندوستان کی [illegible] زبان ہندی ہندوستانی ہوگی۔ مولوی صاحب موصوف نے اس کی [illegible] زبان ہندوستانی ہونی چاہئے جس میں اردو ہندی دونوں شامل [illegible] ہندی ہی مخصوص ہوگی۔ اس وقت گاندھی جی نے جو الفاظ [illegible] زبانی سنے۔ ان کا یہ مضمون ہندوستان کے ہر اخبار میں [illegible] کی تصدیق پنڈت جواہر لال نہرو نے خود کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

"مہاتما جی نے ایک بات ایسی کہی جس کو سن کر بہت افسوس ہوا۔ انہوں نے کہا کہ "اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا مسلمان چاہیں تو اس کو رکھیں اور پھیلائیں۔"

کیا اس حقیقت کے بعد کسی کو یہ کہنے کی ہمت ہے کہ کانگریس آزادی کی خواہش تک بھی دل میں رکھتی ہے۔ کئی سال سے متواتر جب کبھی بھی کانگریس کا اجلاس ہوتا ہے تو ہندی ساہتیہ پریشد کا اجلاس ساتھ ساتھ ہوتا ہے اور اس میں تمام کانگریسی ہندو شرکت کرتے ہیں۔

مدراس میں کانگریسی حکومت نے صاف حکم نافذ کر دیا ہے کہ تمام کام ہندی میں ہونے چاہئیں اکثر صوبوں میں آج تک عدالتی زبان اردو رہی ہے۔ لیکن تمام کوشش اسی پر صرف کی جا رہی ہے کہ ہندی عدالتی زبان ہو جائے۔ سرحد میں جہاں ۹۰ فیصدی مسلمان ہیں۔ جب اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا تو تمام ہندوستان کے کانگریسی ہندوؤں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ خاص پشاور میں جا کر تقریریں کیں برخلاف اس کے اودھ کے بہت سے اضلاع میں مسلمان بچوں کو جہاں مسلمان قلیل تعداد میں ہیں زبردستی ہندی پڑھائی جا رہی ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ دعویٰ وہی آزادی کا ہے۔

مہاتما گاندھی جس قسم کی زبان ہندوستان میں رائج کرنا چاہتے ہیں وہ ہندی برائے نام ہے اور اصل میں سنسکرت ہے۔ آپ نے خود فرمایا کہ میں وہ ہندی

چاہتا ہوں جو رسالہ "ہنس" کی زبان ہے۔ اس زبان کا ایک نمونہ میں ذیل میں درج کرتا ہوں۔ یہ رسالہ "ہنس" کے ایک مقالہ سے لیا گیا ہے جو کہ اس نے حالی مرحوم کی صد سالہ جوبلی کے موقع پر قلمبند کیا تھا۔ یہ اس کے خیال سے آسان ہے اس لئے کہ ایک مسلمان مشہور لیڈر کے متعلق لکھا گیا ہے۔ بہرحال نمونہ ملاحظہ ہو۔

سورگیہ مولانا حالی اردو سہتیہ کے یگ پرورتکوں میں ہیں اور گت ستباہ جنمستان پانی پت میں ان کی جانتی جس سمرہ وہ سے منائی گئی۔ وہ ان کی شان کے سرد تھا یوگیہ تھی۔ سبھاپتی کے آسن کو ہز ہائینس نواب صاحب بھوپال نے سشوبھت کیا تھا اور بھارت کے پرتک پرانت سے بھگتوں نے آکر اپنی شردھانجلی انکی سمرتی کی بھینٹ کی۔ ان میں نواب بھی تھے سیتہ کے اپاسک بھی تھے۔ علیگڈھ اور عثمانیہ سے دسودوالیوں نے بھی اپنے پرانت ندی بھیجے تھے۔

یہ ہے کہ وہ زبان جو گاندھی جی ہندوستان میں قائم کرنا چاہتے ہیں اور جس کیلئے ہر ایک کانگریسی جدوجہد میں مصروف ہے۔ یہی وہ معاملات ہیں جنہیں ہر ہندو خواہ وہ مہاسبھائی ہو یا کانگریسی، کلی اتفاق ہے۔ یہ تو بدقسمت مسلمان ہی ایسی قوم ہے کہ اسکو کسی مسئلہ پر اتفاق نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی آنکھوں سے ان تمام باتوں کو دیکھ رہے ہیں اور خاموش ہیں۔ بلکہ ان کی تائید میں مصروف ہیں۔ مسلمانوں کی اس زبون حالی کو اقبال نے خوب کہا ہے۔ ؎

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک — ایک ہی سب کا نبی دین ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک — کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اقبال

کانگریس اور لاہور کی مسجد شہید گنج

اسی طرح کانگریس کا طرز عمل مسجد شہید گنج کے معاملہ میں سخت ذلیل اور پست رہا ہے۔ جب کہ کانگریس اپنے بلند بانگ دعووں میں مصروف تھی کہ وہ صرف آزادی کے لئے لڑ رہی ہے۔ پنجاب میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ان کے مذہبی جذبات سے کھیلا جا رہا تھا۔ ان کی مقدس مسجد کو شہید کیا جا رہا تھا۔ پنجاب کا ہر کانگریسی مسجد کو شہید کرانے میں معاون اور ساعی تھا۔ اگر کانگریس سے مدد طلب کی گئی۔ تو جواب ملا کہ وہ مداخلت نہیں کر سکتی۔ اگر جواہر لال سے درخواست کی گئی تو سنکر ازجواب ملا کانگریس کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ ایسے چھوٹے چھوٹے حالات میں وقت ضائع کرے۔ مگر وہی کانگریس اور وہی جواہر لال اور گاندھی جی اب سے ایک ماہ پیشتر صرف ایک بوچڑ خانے کی تعمیر ہونے پر سخت بے چین تھے۔ انہوں نے ہر کوشش اور سول نافرمانی کی دھمکی سے ڈسٹرکٹ کو مجبور کر دیا کہ وہ بوچڑ خانے کا حکم منسوخ کر دے اور سیکڑوں مسلمان قصائیوں کی بیروزگاری میں اضافہ کر دے۔

وہی جواہر لال بنارس میونسپلٹی کی اس تجویز کی تہ دل سے آج تائید کرتے ہیں کہ بنارس میونسپلٹی کی حدود میں گاؤکشی نہ ہونی چاہئے۔ ع

ببین تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا

ان سب باتوں کے باوجود ان حضرات کو کہاں تک سمجھایا جائے کہ کانگریس کے دماغ میں ہی آزادی کا تخیل نہیں ہے۔ میں نے جتنے واقعات اپنے اس ثبوت میں پیش کئے ہیں کہ کانگریس صرف ہندوؤں کے حقوق حاصل کرنے اور مسلمانوں کے حقوق فنا کرنے میں مصروف ہے۔ میں چیلنج کرتا ہوں کہ خدا کے لئے کوئی صاحب بتا دیں کہ ان میں کون سی بات خلاف واقعہ ہے۔ کیا آزادی حاصل کرنیوالی جماعتیں اردو اور ہندی، گئو رکھشا، بوچڑ خانوں اور کیونل ایوارڈ کی مخالفتوں میں اپنی طاقتیں

صرف کیا کرتی ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر نیک نیتی اور صاف نظری رہنمائی کرے تو کوئی سمجھدار آدمی کانگریس کے اس فریب میں آنے کو تیار نہ ہوگا۔ میں نے خود پنڈت جواہر لال صاحب سے آنند بھون میں اور لکھنؤ میں ان باتوں کو پیش کیا میں نے خود کانگریس کے بڑے بڑے رہنماؤں سے معلوم کرنا چاہا کہ شاید میں غلطی پر ہوں لیکن افسوس کہ مجھ کو تسلی نہ ہو سکی بلکہ ان کے جوابات اور دل شکن معلوم ہوئے۔

جب یہ ظاہر ہے کہ کانگریس آزادی کے لئے نہیں لڑ رہی ہے بلکہ اس کی تمام جد وجہد صرف کناڈا اور افریقہ کی طرح نوآبادی کا درجہ حاصل کرنا ہے جس کی رو سے بیرونی تسلط باقی رہے گا اندرونی معاملات میں اکثریت کو حکومت کرنے کا حق حاصل ہو اور دوسری طرف اس کا یہ زبردست خفیہ پروگرام ہے کہ مسلمانوں میں انتشار پیدا ہوتا رہے تو کیا ایسی صورت میں ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم بھی جماعت میں شرکت کریں۔

کانگریس اور مسلم عوام

یہ سوال بہت ضروری ہے کہ آخر گزشتہ الیکشنوں کے بعد ہی کانگریس نے مسلمانوں کی طرف تمام توجہ کیوں صرف کی اور یہ مٹھی بھر مسلمان کیوں چار ماہ سے کانگریس کی تعریف میں قصیدہ خواں ہیں۔ کانگریس چار ماہ سے پہلے بھی تھی اس وقت کیوں شرکت کی اتنی زبردست کوشش نہ تھی، اس زمانے میں کیوں لیگ کی تنظیم کی جا رہی تھی۔ اور اب کیوں زمانہ بدل گیا۔

حقیقت میں یہ ایک کانگریس کی زبردست چال ہے۔ جو ابھی سے خطرناک نتائج پیدا کر رہی ہے۔ گزشتہ الیکشن میں ایک طرف تو مسلمان سب کا [illegible] ہو گئے تھے رجعت پسندوں کا طبقہ الگ ہو گیا تھا علاوہ تمام قوم پرست طبقہ سمجھا [illegible] یہ ہندو [illegible] اور کانگریس کے زیر تحت خطرناک ثابت ہی وہ کب گوارا کر سکتی تھی

مسلمان منظم ہو کر میدان میں آئیں، دوسری طرف کانگریس کو مسلمانوں میں بہت ناکامی رہی تھی۔ کانگریس نے سترہ آدمی لیگ کے مقابلہ میں کھڑے کئے تھے اور سترہ ہی ہار گئے تھے۔ بالخصوص لکھنؤ میں باجدہ بانو اور جھانسی میں کانگریس کو زبردست شکست ہوئی تھی۔ اس سے کانگریس کے حلقوں میں ہل چل مچ گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ شہر کے لوگ تو کانگریس کی پالیسی سے واقف ہو گئے ہیں۔ محمد علی جناح اور مسلم لیگ بغیر معاہدہ کے کانگریس میں داخل ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ اس لئے اس نے طے کیا کہ دیہات میں سے براہ راست عوام کو کانگریس میں آزادی اور روٹی کے مسئلہ پر لایا جاوے کاشتکاروں کو روٹی کا لالچ دے کر ممبر بنایا جاوے۔ اس کے لئے ایک خاص کمیٹی مسلمان عوام سے رابطہ کے لئے قائم کی گئی۔ کانگریس کے پاس روپیہ ہے اس کے وزیر عہدوں پر ہیں۔ طاقت ہے اسی لئے جواہر لال نے بہت غرور کے ساتھ چیلنج دیا کہ "ہمارے اندر اتنی طاقت ہے کہ ہم مسلمانوں کو کانگریس میں کھینچ لیں"۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا اس وقت کانگریس میں شرکت کرنا اس کی طاقت کا شکار ہونا ہے اور محض آلۂ کار بننا ہے تاکہ آئندہ الیکشن میں کانگریس دنیا کو یہ بتا سکے کہ مسلمان بھی اس کے ساتھ ہیں اور جو حقوق مسلمانوں کے پامال ہوں ان میں مسلمانوں کی بھی رضا اور منشا شامل ہے۔

بیرونی ممالک کے مسلمان ہندوستانی مسلمانوں کی اس مرعوب ذہنیت پر ماتم کر رہے ہیں کہ اگر مسلمانوں کو کانگریس میں آنا تھا تو انتخابات سے پہلے آنا چاہئے تھا جب کہ ان کی حکومت قائم ہو گئی تو مسلمانوں نے مرعوب ہو کر کانگریس میں داخلہ شروع کر دیا اور بہانہ یہ ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب وغیرہ ترغیب دے رہے ہیں۔

آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ مولانا نے تو ہمیشہ مسلمانوں کو شرکت کے لئے کہا ہے لیکن جب مولانا کئی مرتبہ جیل تشریف لے گئے تو ایک بھی کانگریس کا ممبر نہ ہوا اور جب کہ حکومت سے مرعوب ہو کر خود کو دیہاتیوں اور ملازمتوں کے لالچ اور کچھ سیاسی فریب

ہیں اگر کانگریس میں داخل ہو رہے ہیں تو بجا نہ مولانا حسین احمد صاحب کا ہے لیکن یہ ایک وقتی تاثر ہے بہت جلد مسلمانوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔ شعر

دیکھ لوگے سطوت رفتار دریا کا مآل
موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائیگی

گاندھی جی اور اچھوت ادھار"

ہندو قوم نے چار ہزار برس سے جو سلوک اچھوتوں کے ساتھ روا رکھا ہے اسکی مثال تمام انسانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں۔ جب کہ ہر شخص اور ہر قوم اپنی آزادی کے لئے جد وجہد میں مصروف ہے اچھوتوں نے بھی سوسائٹی کی ان بندشوں کو توڑنے کی کوشش کی اور بہت سے عیسائی اور مسلمان ہو گئے۔ اچھوتوں کا اسطرح دوسرے مذاہب قبول کرنا ہندو لیڈران کے لئے بیحد باعث تشویش ہوا۔ اسلئے کہ اگر سب اچھوتوں نے اسطرح ہندو مذہب کو چھوڑ دیا تو ہندو اکثریت میں بہت کمی آجائیگی۔ یہی وجہ تھی کہ گاندھی جی اور مالویہ وغیرہ نے اچھوت ادھار کی طرف کچھ توجہ صرف کر کے ان کی تسلی کرنی چاہی مگر ہندو قوم جو قدامت پرستی اور چھوت چھات کے معاملہ میں بیحد سخت واقع ہوئی ہے۔ ان تحریکوں سے متاثر نہیں ہوئی گاندھی جی ایک سال کے دوروں اور بہت کوششوں کے بعد اگر کچھ کر سکے تو صرف یہ کہ اچھوتوں کی نشستیں ہندوؤں میں شامل ہیں اور ہندوؤں کی اکثریت پر کوئی اثر نہیں پڑا اور نہ بیچارے اچھوتوں کی حالت جو پہلے تھی بدستور ویسی ہی ہے۔ شعر

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

اچھوت ادھار کی اسکیم محض ایک سیاسی قدم تھا۔ ورنہ جو لوگ اس قسم کی سیاسی چالوں سے واقف ہیں خوب جانتے ہیں کہ گاندھی جی کے فاقوں اور دھمکیوں سے اگر اچھوتوں کی نشستیں ہندوؤں میں شامل ہو گئیں تو ان کی موجودہ پستی میں کیا فرق واقع ہو گیا کتنے ہندوؤں نے ان کو اونچی ذات میں شامل کیا اور کتنے ہندوؤں میں ان کو شریک ہونے کی اجازت مل گئی

مہاتما گاندھی صرف یہ چاہتے تھے کہ اچھوتوں کا انتخاب جداگانہ نہ ہو وہ جسطرح ہر چیز کو فرقہ وارانہ حیثیت سے دیکھنے کے عادی ہیں انھوں نے اس مسئلہ کو بھی بالکل فرقہ وارانہ بنا دیا چونکہ اچھوتوں میں یہ عام اسپرٹ پیدا ہو چکی تھی کہ اگر ان کو برابر حقوق نہ دئے گئے تو وہ مسلمان ہو جائیں گے اور یہ گاندھی جی اور ان کے رفقاء کے لئے بہت بڑا خطرہ تھا۔ اس لئے انھوں نے گول میز کانفرنس تک میں اچھوتوں کو ہندوؤں میں شامل رکھنے میں بیحد کوششیں کیں۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے چودہ نکات وہ صرف اسی شرط پر منظور کرنے کو تیار تھے کہ مسلمان اچھوتوں کے لئے مخلوط انتخاب تسلیم کریں۔

سنہ ۲۲ء اور ۲۳ء میں جب مسلمانوں نے اچھوتوں میں کچھ کام کرنا شروع کیا تھا۔ اور ان کی اصلاح کے لئے بعض انجمنوں نے کوشش کی تھی تو گاندھی جی وغیرہ کو اسی وقت خطرہ ہوا تھا کہ کہیں اسطرح مسلمان تبلیغ اسلام اچھوتوں میں شروع نہ کر دیں ۲۰۔ دسمبر ۲۳ء کے ملاپ کا مندرجہ ذیل بیان اس خیال کی پوری تائید کرتا ہے مہاتما جی کو یہ سن کر (کہ مسلمان اچھوتوں میں اصلاحی کام کر رہے ہیں) بڑا دکھ ہوا اور کہنے لگے کہ مجھے تو اس کا پتہ تک نہیں۔ آپ کی غلطی ہے جو آج تک خاموش تھے یہ بہت برا ہوا۔ کم از کم مجھے اس کی اطلاع ملنی چاہئے تھی۔ اچھوت ادھار کا کام صرف ہندوؤں کا ہے۔

مہاتما جی کی فرقہ وارانہ ذہنیت کا اس سے زیادہ اور کیسا ثبوت ہو سکتا ہے۔ ع
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں۔

روٹی کے سوال کی آڑ

کانگریس اور دنیا کی ہر جماعت مسلمانوں کے مذہبی جذبے سے خوب واقف ہے دنیا کا ہر شخص واقف ہے کہ صرف مذہب کی آواز ایسی ہے جو مسلمان کو منظم کر سکتی ہے اور جس کے لئے مسلمان اپنی ہر متاع بیش بہا کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو

جاتا ہے۔ اس لئے اس مرتبہ کانگریس نے اس جذبے کو ختم کرنے کے لیے نیا حربہ استعمال کیا اور وہ روٹی کا سوال ہے۔ کانگریس ہرگز نہیں چاہتی کہ مسلمان کانگریس میں بحیثیت جماعت داخل ہوں یا مذہبی حیثیت سے کوئی منظم جماعت رکھتے ہوئے کانگریس میں آئیں بلکہ وہ صرف ہندوستانی ہو کر آئیں اور اقتصادی مسئلہ کو حل کرنے میں کانگریس کا ہاتھ بٹا دیں۔ وہ مسلمانوں کو تسلی آمیز لہجہ میں خطاب کرتے ہیں کہ ملک میں ہندو مسلم کوئی سوال نہیں ہے بلکہ اصل جنگ سرمایہ دار اور مزدور کی ہے ملک کو روٹی کی ضرورت ہے اس لئے کانگریس میں صرف سیاسی اور محض اقتصادی مسائل کا حل تلاش کرنے کی غرض سے مسلمانوں کو شریک ہونا چاہیئے

یہ حقیقتاً بہت خطرناک حربہ ہے جو کانگریس نے مسلمانوں کی تنظیم کو ختم کرنے کے لئے ایجاد کیا ہے۔ اس لئے کہ جس روز مسلمانوں نے سیاست کو غیر مذہبی چیز سمجھ لیا اسی روز انکی تنظیم اور مذہب کا خاتمہ ہے دنیا میں صرف مسلمان ہی وہ قوم ہے جسکے اندر سیاست اور مذہب میں کوئی فرق نہیں ہے سیاست اور مذہب اسلام میں ایک تصویر کے دو رخ ہیں ع

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

علاوہ اس کے غور طلب بات یہ ہے کہ کیا واقعی مسلمانوں کو اقتصادی مسئلہ کا حل کانگریس میں حاصل ہو سکتا ہے ؟

اس کے متعلق صرف اتنی عرض ہے کہ مسلمان کو روٹی کا سوال کبھی پریشان کر ہی نہیں سکتا۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اقتصادی حل سب سے بہترین شکل میں پیش کیا ہے جس چیز کو لینن اور ٹراٹسکی برسوں کی بد و جہد کے بعد معلوم نہیں کر سکے اور چوٹی یورپ کی ہزاروں سلیکٹ کمیٹیاں اور کانفرنسیں طے نہیں کر سکیں اس کو تیرہ سو برس پیشتر عرب کے صحرا کے ایک امی مزدور نے بطحا کی کنکریوں پر بیٹھ کر حل کر دیا ہے۔ وہ روس کا سوشلزم یا اشتراکیت نہیں ہے بلکہ وہ اسلامی مساوات کا سبق "لیس للانسان الا ما سعیٰ" میں مخفی ہے اقبال نے صاف کہا ہے۔

کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار
حکم حق ہے لیس للانسان الا ما سعیٰ

اسلام کا قانون وراثت، سود کا یکسر بند کرنا اور چالیسواں حصہ جبریہ ٹیکس (زکوٰۃ) یہ ایسی چیزیں ہیں کہ آج دنیا ان پر عمل کرے تو تمام اقتصادی مسئلے خود بخود حل ہو جاویں۔ پھر یہ کس قدر لغو سوال ہے کہ مسلمان اقتصادی حل کانگریس میں تلاش کریں۔ مسلمان کے لئے جس چیز کی آزادی کی ضرورت ہے وہ روٹی نہیں ہے بلکہ اس کا مذہب ہے اسمیں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کا مسلمان مسئلہ اقتصادیات کا بہت شکار رہا ہے۔ اسی لئے اقبال نے کہا ہے

ع مسلم ہندی شکم را بندہ

لیکن اصل میں مسلمان اگر ہمیشہ بھوکا رہے اگر اس کو پیٹ سے پتھر باندھ کر جنگ کرنا پڑے تب بھی وہ مذہب پر روٹی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اصل اسلام اسی زمانہ میں تھا۔ جب مسلمان بھوکے تھے، جب ان کے پیغمبر اور صحابہؓ کئی کئی وقت فاقہ نشین رہتے تھے وہی زمانہ تھا جب اسلام آزاد تھا اور اسلام کو زوال اس تاریخ ہی سے شروع ہوا جب بغداد میں دار الخلافہ تبدیل ہونے کے بعد مسلمان خلفاء میں قیصر و کسریٰ جیسی شان و سطوت آ گئی تھی۔ مذہب ایک ایسی چیز ہے جس کی آزادی ہر سچے مسلمان کے لئے محبوب ترین شے ہے، مذہب کی آزادی سے کانگریسی حضرات یہ مراد لیتے ہیں کہ مسلمان نماز پڑھ سکتے ہیں۔ روزہ رکھ سکتے ہیں پھر اسلام آزاد کیوں نہیں ہے لیکن انھیں کیا معلوم کہ آزادی اسلام کچھ دوسری ہی شے ہے۔

ملا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

مذہب کی آزادی میں پرسنل لا، قانون شریعت، بیت المال کا قیام وغیرہ وغیرہ بہت سے مسائل ہیں جن کو اسی وقت بوجوہ احسن انجام دیا جا سکتا ہے۔ جب کہ خود مسلمان اولی الامر ہوں اور "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کی طاقت رکھتے ہوں

بیشک کانگریس کے سامنے سب سے بڑا روٹی کا مسئلہ ہے فرض کیجیے اس کے لیے اگر برطانیہ کوئی راستہ نکال کر رکھدے جس کی رو سے مزدوروں اور کسانوں کی حالت ٹھیک ہو جائے اور مسلمانوں کے کچھ حقوق کم کر دیے جائیں یعنی کمیونل ایوارڈ (فرقہ وارانہ تقسیم) منسوخ کر دیا جاوے تو وہ مطمئن ہو جاویں گے وہ تو ایسے قیدی کی طرح ہیں جو اس بات میں خوش ہے کہ اس کو ہمیشہ جیل میں رکھا جائے۔ مگر دونوں وقت کھانا پیٹ بھر کر ملتا رہے مگر مسلمان ایسے پیٹ بھر کر رہنے کو آزادی کی موت پر ترجیح دیتا ہے۔

لہذا مسلمان کے سامنے روٹی کا سوال پیش کرنا اور اقتصادی مسئلہ میں اسکو شرکت کی دعوت دینا یقیناً ہندوؤں اور کانگریس کے نکتۂ نظر سے نہایت مفید ہے مگر مسلمان کے لیے سم قاتل ہے۔ مسلمان صرف اسلامی مساوات کو اختیار کر سکتا ہے اور اس کے نزدیک ایسی جماعت کی شرکت بھی ناجائز ہے۔ جو روس کی سی اشتراکیت ان کے ملک میں پھیلانا چاہتی ہے۔

روس میں تمام مساجد اور عبادت گاہیں حکومت کے حکم سے گرا دی گئیں۔ وہاں مذہب کا نام بھی سخت جرم ہے اور ذاتی ملکیت جن کی بنا پر اسلامی قانون وراثت کی بنیاد ہے۔ وہاں تو یہ جرم ہے۔ کانگریس کے پروگرام کا سب سے بڑا جزو ہندوستان میں اشتراکیت پھیلانا ہے۔ لہذا کسانوں اور زمینداروں کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کے بجائے انہوں نے جماعتوں کی جنگ شروع کر دی ہے۔ کانگریس میں سوشلسٹ کی بہت بڑی جماعت ہے۔ جو روس کے نظام کو ہندوستان میں جلد از جلد لانا چاہتی ہے خود جواہر لال نہرو اور مسٹر ایم این رائے اس خیال کے سب سے بڑے ہیرو ہیں۔

پنڈت جی نے بہ حیثیت صدر کانگریس اجلاس لکھنؤ میں جو ارشادات فرمائے تھے میں ان کو بجنسہ نقل کرتا ہوں واضح رہے کہ یہ الفاظ ان کے ذاتی خیالات نہیں بلکہ بحیثیت صدر کانگریس تھے اور اب بھی وہ برابر عمل پیرا ہیں۔

"ہم کو ایک نئے تمدن کی بنیاد ڈالنا ہوگی جو موجودہ سرمایہ دارانہ تمدن سے

بالکل مختلف ہوگا۔ اس کے کچھ مناظر ہم کو روس کی حکومت کی روایات میں نظر آتے ہیں ایک نئے تمدن اور ایک دلکش آغاز کو میں اس اندوہناک زمانہ میں مستقبل کے لیے ایک مبارک فال سمجھتا ہوں۔ مستقبل کے متعلق اگر امیدیں قائم کیجا سکتی ہیں۔ تو یہ صرف روس ہی کی بدولت ہے سوشلزم میرے لیے ایک اقتصادی نظریہ ہی نہیں جس کو میں پسند کرتا ہوں بلکہ یہ میرا پختہ ایمان اور عقیدہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کانگریس ایک سوشلسٹ ادارہ بنجائے اور دنیا کی ان قوموں سے اتحاد عمل کرے جو نئے تمدن کو قائم کرنے میں کوشاں ہیں"

اس کا ایک ایک لفظ اسلام کے خلاف اور اس کی تعلیم کے سخت مخالف ہے مولانا اشرف علی صاحب نے حال ہی میں فتویٰ صادر فرمایا ہے جس کی رو سے مسلمانوں کا اس جماعت میں شامل ہونا ناجائز فرمایا ہے۔ جس کے پروگرام میں اور جس کے ارکان کی ایک جماعت کے عقائد میں روسی اشتراکیت شامل ہو۔

کانگریس نے اپنے اس بلند بانگ دعوے میں بھی فرقہ وارانہ ذہنیت کا پورا ثبوت دیدیا ہے کہ اس کے سامنے اصل مسئلہ سرمایہ داروں اور زمینداروں کے خلاف جنگ کرنا ہے لیکن اصل میں اس کے سامنے صرف ہندو کاشتکاروں اور مزدوروں کا مسئلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ یوپی میں کاشتکاروں کے مفاد کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔ چونکہ اس صوبہ میں ہندو کاشتکاروں کی تعداد نوے فیصدی ہے اپنے پوری قوت کے ساتھ بنگال میں کاشتکاروں کے حقوق کی مخالفت کی صرف اس لئے کہ وہاں کاشتکار مسلمان زیادہ ہیں یوپی کے کاشتکار کے معنی دوسرے ہیں اور بنگال میں دوسرے ہیں پھر اگر اس کو کاشتکاروں سے واقعی ہمدردی ہے تو وہ ان کو مہاجنی سود سے نجات دلانے کی کیوں کوشش نہیں کرتی۔ جب کہ مسلم لیگ کے پروگرام کا سب سے اہم جزو

مہاجنی سودے کا شکاروں کو نجات دلاتا ہے کانگریس نے اسکو اپنے پروگرام تک میں شامل نہیں کیا اور نہ کوئی کوشش سود بند کرانے کی کی اس لئے کہ سود کے شکار زیادہ مسلمان اور مہاجن سو فیصدی ہندو ہیں۔

کھدر کی اسکیم میں کانگریس نے وہ ذرائع اختیار کئے ہیں جن سے سو فیصدی فائدہ ہندوؤں کو ہوتا ہے۔ کانگریس مسلمان جولاہوں کے کپڑوں کی سرپرستی نہیں کرتی بلکہ اپنی نگرانی میں مختلف مقامات میں اسپنرس ایسوسی ایشنز قائم کئے ہیں۔ جن میں ہاتھ سے کپڑا بنا جاتا ہے۔ انکا قانون ہے سوت تک مسلمان جولاہوں سے نہیں خریدا جاتا بلکہ ہندو ملوں سے سوت خرید کر یا ہندو گرمیوں سے بنوا کر کپڑا بنا جاتا ہے اسطرح بیچارے مسلمان جلاہوں کے حقوق کی پامالی کیجاتی ہے۔ کھدر کی جتنی دکانیں کانگریس کی سرپرستی میں "کھدر بھنڈار" وغیرہ کے ناموں سے قائم ہیں۔ ان میں شاید ایک بھی مسلمان کی نہیں ہے۔ انھیں وجوہات کی بنا پر کھدر پر اتنا زور صرف کیا جاتا ہے اور چمڑے کی تجارت چونکہ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے اس طرف کوئی توجہ نہیں دیجاتی۔

اس طرح پر اقتصادی پروگرام میں بھی فرقہ وارانہ ذہنیت سے کام لیا جاتا ہے۔

اقتصادی حربہ اور سیلاب الحاد

گھر پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

اس خاص اقتصادی پروگرام (جو سراب صحرا سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے) اور مذہب سے سیاست کو الگ کرنے کا بڑا اثر یہ ہوا کہ الحاد اور لامذہبی کا فتنہ پھیلنے لگا اور برابر پھیلتا جا رہا ہے۔ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ جو پہلے ہی سے مذہب سے ناآشنا

اور جو اس حقیقت سے خود ہی بے خبر ہے کہ اسلام نے تیرہ سو برس پیشتر وہ اقتصادی پروگرام دنیا کے سامنے رکھدیا ہے کہ اس سے پیشتر آجتک کوئی پروگرام نہیں بن سکا جب ان کے سامنے سوشلزم اور اشتراکیت کی موہوم تصویریاں رکھی جاتی ہیں تو وہ اور بھی گمراہ ہوتے جاتے ہیں یقین اور تشکیک کا وہ فلسفہ جس کو اقبال نے۔

"قلب او مومن دماغش کافر است"

کہا ہے ہمارے نوجوانوں کو مذہب سے بالکل منحرف کر دیتا ہے اور ان کے نزدیک مذہب اور اخلاق کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی ان کے سامنے اگر کوئی سوال قابل توجہ رہتا ہے تو وہ "روٹی" کا ہے۔ مسٹر نقوی (لکھنؤ یونیورسٹی) کا واقعہ ایسے ہزاروں واقعات میں سے ایک واقعہ ہے۔ گذشتہ سال یونین کے انتخابات کے موقعہ پر جب ان سے دریافت کیا گیا کہ وہ مسلمان ہیں یا نہیں تو انھوں نے صاف جواب دیا کہ ان کے باپ دادا ضرور مسلمان تھے۔ مگر وہ خود کوئی مذہب نہیں رکھتے۔ اس پر ان کا نام مسلمان امیدواروں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔

کانگریسی اخبارات نے اس واقعہ کو اتنی اہمیت دی کہ انھوں نے مسٹر نقوی کو اپنے وقت کا ہیرو کہا اور ہندوستان ٹائمز نے ان کو "نئی دنیا کی صبح صادق کا پیغمبر" تک لکھا صرف اس لئے کہ انھوں نے اپنے آپ کو "لامذہب" بتایا اور اس سال ان کو اس صلہ میں غیر مسلم پارٹی کی طرف سے بلا مقابلہ یونین کا صدر بنایا گیا۔

خود کانگریس کے قائد اعظم پنڈت جواہر لال نے خود اپنی نوشتہ سوانح عمری اور مختلف مضامین میں مذہب اسلام کا مضحکہ اڑایا ہے۔

دو تین سال ہوئے آپ نے جیل سے آتے ہی ایک مضمون "ماڈرن ریویو" میں علامہ اقبال کو خطاب کرتے ہوئے لکھا تھا اور اقبال کے "وحدانیت اسلام" کے تخیل کا مذاق اڑایا تھا کہ اقبال بیسویں صدی میں تمام دنیا میں تیرہ سو برس پیشتر کا اسلام پھیلانا چاہتے ہیں اقبال نے جو مکمل اور مدلل جواب اس کا دیا تھا

وہ کتابی شکل میں تمام ہندوستان میں تقسیم کیا گیا تھا۔

اپنی سوانح عمری میں تو پنڈت جی نے عجیب عجیب طریقوں سے "اسلام نوازی" فرمائی ہے۔ مثال کے طور پر یہاں چند اقوال درج کرتا ہوں۔

"ان لوگوں نے کبھی عقیدے کی سختی کے ساتھ پابند ہوں اس موضوع پر بحث کرنا ہمیشہ دشوار ہوتا ہے۔ خصوصاً مسلمانوں سے مذہب کے معاملہ میں گفتگو کرنا دشوار ہے۔ اس لئے کہ ان کے مذہب میں آزادی رائے کی زیادہ گنجائش نہیں ہے (صفحہ ۲۰۳ میری کہانی)

اس کے بعد جو کچھ انھوں نے (مولانا محمد علیؒ) نے کہا اس پر

دوسری مثال واقعی مجھے بہت تعجب ہوا کہنے لگے کہ میرا ایمان ہے جو کوئی بھی قرآن کو بے تعصب ہو کر تلاش حق کے خیال سے پڑھیگا وہ اس کی صحت کا ضرور قائل ہو جائیگا" (صفحہ ۲۰۴)

کمال یہ ہے کہ پنڈت جی اسلام اور قرآن کے متعلق اس قسم کے خیالات رکھتے ہیں اور مسلمانوں کی تہذیب کو "ڈوٹی دار لوٹے اور گول پاجامے" سے زیادہ نہیں سمجھتے مگر ہندو مذہب کے متعلق جو آپ کا خیال ہے اسکو سنئے فرماتے ہیں۔

"اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندومت پر صحیح معنی میں لفظ مذہب کا اطلاق نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود اس کی کشش کتنی سخت ہے۔ اور اس کی بقا میں کتنی قوت موجود ہے (صفحہ ۲۰۲ و ۲۰۳)

ان میں (محمد علیؒ) اور مجھ میں خدا کے وجود پر اکثر بحث رہا

خدا کے وجود سے انکار کرتی تھی۔ محمد علیؒ کو یہ عادت تھی کہ کانگریس کی قراردادوں میں کسی نہ کسی عنوان سے خدا کا ذکر ضرور کر دیا کرتے تھے۔ مثلاً شکر کے طور پر یا دعا کے انداز میں۔ میں برخلاف اس کے احتجاج کرتا (صفحہ ۱۰۰)

ان (محمد علیؒ) پر مذہب کا رنگ بہت گہرا تھا جس پر سے مجال نہیں عقلیت

مذہب اور عقل کی جھلک تک نہ تھی ہر معاملہ میں اس معاملہ بالکل عکس تھا (صفحہ ۳۰)

خیال کیجئے وہ نوجوان طبقہ جو پنڈت جی کے اقوال کو اپنا آئیڈیل اور نصب العین بناتے ہوئے ہے اس قسم کے کلمات سے کیا اثر لیگا۔ الحاد کا جو سیلاب بڑھ رہا ہے اس سے آئندہ چل کر جو نقصانات ملت اسلامیہ کو پہنچنے والے ہیں انکے تدارک سے ہمارے علماء بالکل بےخبر ہیں

مسلم خواتین میں کانگریس کا مکروہ پروپیگنڈا

عورتوں کے فرائض اور حقوق کا نظریہ مسلمانوں کا برادران وطن سے بالکل مختلف ہے کوئی شک نہیں کہ ہندو عورتوں نے گزشتہ تحریک میں بہت حصہ لیا مگر مسلمان یہ کام عورتوں کے لئے مناسب نہیں سمجھتے۔ عورتوں کے اوپر بہت سے دوسرے فرائض ہیں وہ آئندہ نسلوں کی اصلاح کرنے والی ہیں۔ مگر پردہ سے باہر نکل کر میدان سیاست میں آنا ان کا کام نہیں ہے۔ جب تک دنیا میں عصمت کی کوئی عزت باقی ہے اس وقت تک پردہ سوسائٹی کے لئے سخت ضروری ہے مگر کانگریس کا سب سے بڑا جہاد پردہ کے خلاف ہے۔ جواہر لال اور دوسرے زعماء کانگریس کے ہزاروں مضامین اور تقریریں پردہ کے خلاف ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان خواتین بھی باہر نکل کر اسی طرح پکٹنگ اور دوسرے کام کریں اور جیل جائیں۔ جس طرح ہندو دیویاں انجام دے رہی ہیں۔ کانگریس نے الیکشن کے وقت جو اعلان شائع کیا تھا اس کے صفحہ ۵ پر یہ الفاظ بالکل صاف درج ہیں۔

"ہندوستان کی عورتیں آزادی کی جنگ میں پورا حصہ لے چکی ہیں اور کانگریس اس وقت کا انتظار کر رہی ہے جب ہندوستان کی عورتیں آزاد طور سے ہندوستان کے شہری حقوق اور فرائض میں مردوں کے ساتھ برابر کا حصہ لیں"

کیا ہمارے مسلمان علماء اس اعلان سے بالکل متفق ہیں اور کیا وہ اس اعلان کو مسلمان عورتوں پر منطبق کرنے کو تیار ہیں؟ اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو ایسی جماعت میں شرکت کیسے گوارا کرتے ہیں جبکہ اس کے پروگرام میں ایسی چیزیں داخل ہیں۔

میرٹھ کی مسلم گمنام خاتون کا مفروضہ واقعہ

۱۴ اگست کے تیج میں ایک گمنام خاتون میرٹھ کے نام سے ایک خط شائع کیا گیا کہ وہ خاتون اپنے خاوند سے لڑکر گھر چلی گئی ہیں صرف اس لئے کہ ان کے خاوند نے ان کو اپنے گھر پر کانگریسی جھنڈا لگانے کی اجازت نہیں دی اور جب ڈاکٹر اشرف میرٹھ گئے تو ان کے خاوند نے ان سے ملنے کی اجازت نہیں دی اس لئے وہ اسوقت تک خاوند کے پاس واپس نہیں آسکتیں جب تک کہ خاوند معافی نہ مانگے۔ آخر میں اس مفروضہ عورت نے لکھا ہے کہ۔

"میں نے ۵۰ مسلم عورتیں تیار کر رکھی ہیں جو کہ کانگریس میں اپنا پردہ چھوڑ کر کام کرنے کو ہر وقت تیار ہیں۔ ہمارا بھی دل چاہتا ہے کہ اپنے دیش کی خدمت کریں مگر ہمارے گھر والے ہم کو بہت تنگ کرتے ہیں۔ ہم ہر وقت پردہ میں بند رہتے ہیں۔"

اول تو یہ خط محض جعلی ہے کوئی مسلمان عورت ایسی حرکت نہیں کر سکتی تا وقتیکہ واقعہ تفتیش کے بعد معلوم ہو سکا۔ مسلمانوں کو اس کا جواب طلب کرنا چاہیے اور اگر یہ خدانخواستہ واقعہ ہے تو یہ عبرت خیز درس ہے اور مسلمانوں کو ایسی تحریکوں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس سے زیادہ شرمناک وہ خط ہے جو ۱۴ اگست کے تیج میں ڈاکٹر اشرف صاحب نے شائع فرمایا ہے۔ جس میں انہوں نے ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان میں بیشمار عورتیں پردہ سے باہر نکلنے کو بیچین ہیں اور میرے پاس اور پنڈت جواہر لال صاحب کے پاس سیکڑوں خطوط ایسے آرہے ہیں جس سے اس کا پتہ چلتا ہے آپ نے تحریر فرمایا ہے۔

"بہت کم لوگوں کو اسکا اندازہ ہے کہ چاردیواری میں بند ہماری بہنیں باہر کی تحریکات سے متاثر ہیں واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی عورتیں دنیا کی محروم ترین اور مظلوم ترین قوم ہے اور سیاسی آزادی کے ساتھ اس کی آزادی

اور ترقی بھی وابستہ ہے۔ محنت اور مزدوری کرنے والی عورتیں کسی حد تک آزاد ہیں۔ اس لئے کہ محنت کرنے والے خاوندان کو زیادہ پابندی میں نہیں رکھتے۔ لیکن متوسط درجہ کے لوگ نہایت تنگ نظر اور متعصب ہیں جو عورتوں کو گھروں میں بند رکھتے ہیں۔"

کیا ڈاکٹر اشرف کا مسلمان ہوتے ہوئے ایسی لغو باتیں تحریر میں لانا اور مسلمان عورتوں میں بے پردگی کی تعلیم پیش کرنا قابل برداشت ہے۔

کیا حضرت مولانا حسین احمد صاحب اور دوسرے علماء اپنا فرض نہیں سمجھتے کہ ایسی مذموم تحریکوں کے خلاف اپنی آواز بلند فرمادیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ جب ہندوؤں کے رہنما باوجود اس دعوے کے کہ وہ مذہب کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے، بوچڑ خانوں اور گوکشی کے مسائل پر صاف صاف اپنی ناراضگی کا اظہار کر دیتے ہیں۔ ہمارے علماء کانگریس میں داخل ہونے کے باوجود اپنی آواز ان زعماء کانگریس کے کانوں تک نہیں پہنچاتے جو اس قسم کی لغو حرکتیں کام میں لاتے ہیں۔ شعر

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

صنعت فلم سازی اور کانگریس

کانگریس کے پروگرام کا ایک جزو سینماؤں کی اور فلم سازی کی صنعت کی ہمت افزائی کرنا ہے کانگریس کے اندازاً سو فلم گورنمنٹ نے بند کر رکھے تھے اور ان کو سینماؤں میں چلانے کی اجازت اس لئے نہ دی تھی کہ وہ حکومت کے خلاف تھے۔ جہاں تک حکومت کے اس اقدام کا تعلق ہے اس کا ایسا کرنا بیشک ناانصافی اور ظلم تھا بہرحال اب وہ تمام فلم سینماؤں میں دکھلائے جاویں گے بمبئی ٹاکیز کے ساتھ کانگریس کی خاص ہمدردیاں ہیں۔ خود پنڈت جواہر لال نہرو صاحب دیوکا رانی جو اس کمپنی کی بہترین ایکٹرس ہیں۔ انکے کارناموں اور ایکٹنگ کو بہت پسند فرماتے ہیں یہاں تک کہ

آپ کے لئے بمبئی میں خاص طور سے اس کمپنی نے سینما میں اپنا فلم دکھلایا تھا ہر شخص جانتا ہے کہ جتنا فائدہ سینماؤں سے ہو سکتا ہے اس سے زیادہ نوجوانوں کے اخلاق اور عادات کے لئے وہ سم قاتل بھی ہے اسی لئے سینما کے خلاف علامہ اقبال نے صاف صاف لکھا ہے۔

وہی بت فروشی وہی بت گری ہے — سینما ہے یا صنعت آزری ہے
وہ صنعت نہ تھی شیوۂ کافری تھا — یہ صنعت نہیں شیوۂ ساحری ہے
وہ مذہب تھا اقوام عہد کہن کا — یہ تہذیب حاضر کی سوداگری ہے
وہ دنیا کی مٹی یہ دوزخ کی مٹی
وہ بت خانہ خاکی یہ خاکستری ہے

میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان حالات کے باوجود علما اس وقت تک کانگریس کی شرکت کیسے جائز کر سکتے ہیں۔ یہ کہنا تو صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ ہم کو کانگریس کی اس قسم کی تحریکوں سے کوئی واسطہ نہ ہوگا۔ اول تو یہ ممکن نہیں ہے اس لئے کہ کانگریس فارم پر دستخط کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ کانگریس کے ہر پروگرام کی تائید کی جائے علاوہ اس کے ان عناصر کے خلاف آواز نہ اٹھانا اور محض خاموش رہنا بھی سخت قومی گناہ ہے۔

عذر گناہ بدتر از گناہ

ہم غور کر چکے ہیں کہ کانگریس آزادی ہند کے لئے کوئی جد وجہد نہیں کر رہی ہے میں نے جو ثبوت اپنی اس دلیل میں پیش کئے ہیں میں بار بار چیلنج کرتا ہوں کہ کانگریس کا بڑے سے بڑا حامی ان کو جھٹلا نہیں سکتا۔ ہم خود دیکھ چکے ہیں کہ ایک طرف کانگریس کا تمام زور مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنا اور ان میں مختلف کیمپ قائم کر دینا ہے اور دوسری طرف حکومت سے ہندو حقوق کے لئے جنگ کرنا ہے ان کے سامنے خود کوئی ملکی پروگرام نہیں ہے۔ جو پروگرام ہے یا ان کا راستہ خود جواہر لال کو معلوم نہیں کبھی وہ روس کی

فضا ہندوستان میں لانا چاہتے ہیں اور کبھی وہ زبان اور گئو کشی کے معمولی مسائل میں الجھ پڑتے ہیں۔ ان کے تکبر اور غرور کا یہ حال ہے کہ وہ مسلمانوں سے بحیثیت جماعت کوئی گفتگو کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ کانگریس زبان اور مذہبی معاملات میں کسقدر ہندو مہاسبھائیانہ طرز عمل اختیار کر رہی ہے اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ وہ مسلم خواتین میں بے پردگی اور مسلم نوجوانوں میں الحاد کا پروپیگنڈا کرنے میں کسقدر مصروف ہے پھر کیا ان تمام حالات کے باوجود کانگریس کی شرکت کی کوئی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔

ہاں بیشک ایک وجہ ہمارے سامنے رکھی جاتی ہے اس پر غور کرنا ضروری ہے کانگریس کے ان حامیوں کا خیال ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو بلا کسی شرط کے کانگریس میں داخل ہو جانا چاہئے کہ مسلمان اندر پہنچ کر اپنی آواز بلند کریں۔ باہر رہ کر آواز کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ ہماری ایک ایک بات کو تسلیم کرتے ہیں مگر کانگریس کے تمام گناہوں کے عذر میں جو دلیل پیش کرتے ہیں وہ گناہ سے بھی بدتر اور ناقابل عمل ہے۔

بدقسمتی سے وہ تصویر کا صرف ایک پہلو دیکھتے ہیں۔ اول تو دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سی صورت ہے جس سے مسلمانوں کی کوئی آواز بھی کانگریس کی اتنی زبردست اکثریت کو متاثر کر سکے۔ کمال یہ ہے کہ وہ حضرات مسلم لیگ سے تو اس لئے ناامید ہیں کہ اس پر قبضہ نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ وہاں معاملہ صرف مسلمانوں سے ہے جہاں آج ہمخیالوں کی اکثریت بڑی آسانی سے پیدا کی جا سکتی ہے اور دوسری طرف انہیں یہ یقین ہے کہ وہ کانگریس پر قبضہ کر لیں گے۔ بیشک صرف سندھ اور سرحد کے دو صوبے ہیں جہاں مسلمان اکثریت میں ہو سکتے ہیں۔ پنجاب اور بنگال میں زیادہ سے زیادہ برابر آ سکتے ہیں۔ لیکن دو صوبوں کی اکثریت آل انڈیا کمیٹی میں کیا مفید ہو سکتی ہے، کانگریس کا آئین صوبہ وارانہ تو ہے نہیں اس کے تمام مسائل آل انڈیا مرکزی کمیٹی طے کرتی ہے اس میں مسلمان کسطرح اکثریت میں آ سکتے ہیں یہ ایک معمہ ہے کانگریس کمیٹیوں کے الیکشن کا طریقہ جداگانہ نہیں ہے اس لئے ناممکن ہے کہ مسلمان ڈیلیگیٹ منتخب ہو

بھیجے جا سکیں۔ اب رہی یہ بات کہ وہاں پہنچ کر آپ جس تعداد میں بھی ہوں شور مچا کر کوئی بات منوانا چاہیں۔ تو

این خیال است و محال است و جنوں

گزشتہ واقعات سے عبرت حاصل نہ کرنی بڑی نادانی ہے۔ خلافت کے زمانے میں مسلمان کانگریس کمیٹیوں میں بے تعداد تھے۔ لیکن باوجود اس کے بھی وہ ہندو اکثریت میں ایک بات بھی نہ منوا سکے۔ یہی وجہ تھی کہ بتدریج مولانا محمد علی جوہر مولانا ظفر علیخان اور مولانا حسرت موہانی صاحبان سب ایک ایک کر کے علیحدہ ہو گئے

افسوس یہ ہے کہ جوش اور وقتی تاثر کی رو میں وہ واقعات بھی بھلا دئے گئے جن کی بنا پر مسلمانوں کو کانگریس میں ایک مرتبہ داخل ہو کر پھر علیحدہ ہونا پڑا تھا۔ بڑے بڑے مسائل کو چھوڑیئے یہ کتنا معمولی مسئلہ تھا کہ آل انڈیا سیشن میں جب نماز کا وقت آیا تو مولانا ظفر علیخاں صاحب نے درخواست کی تھی کہ نماز کی وجہ سے اجلاس ملتوی کر دیا جاوے۔ مگر صدر صاحب نے جواب دیا کہ صرف مسلمان جا سکتے ہیں، اجلاس جاری رہے گا۔ جس پر مولانا ظفر علیخاں صاحب اور ان کی پارٹی نے احتجاج کیا مگر بے سود رہا۔ مولانا محمد علی وغیرہ نے جب کانگریس کو چھوڑا تو ارباب کانگریس نے ذرہ بھر بھی پرواہ نہ کی تھی پھر اب وہ کیوں ان بیچین ہیں۔ "بندے ماترم" کی بہت معمولی سی بات ہے۔ مگر آج تک اتنے معمولی معاملہ میں بھی مسلمانوں نے کتنا شور مچایا اور کیا نتیجہ رہا۔ نہ صرف کانگریس اجلاس میں بلکہ اسمبلی حال بعض جگہ مدرسوں تک میں بھی بندے ماترم پڑھا جاتا ہے۔ اگر مدراس اسمبلی میں ایک شخص احتجاجاً ہال چھوڑ کر چلا گیا تو اس کو معافی کے لئے مجبور کیا گیا۔ حالانکہ بندے ماترم کا پڑھا جانا اور مسلمانوں کا اس مجلس میں شریک ہونا ایک حیرت ناک بات ہے، یہ ترانہ اسلام کی سراسر مخالفت کرتا ہے۔ اور مسلمانوں کی ملی غیرت کو کھلا ہوا چیلنج ہے۔

یہ گیت اٹھارویں صدی کے آخر میں بنکم چندر چیٹر جی نے اپنی مشہور کتاب

آنند مٹھ میں تصنیف کیا تھا۔ اس کتاب میں مصنف نے مسلمان بادشاہت کے ختم ہونے اور برطانیہ سلطنت کے قیام کی خوشی کا اظہار کیا ہے اور ہندوؤں کو مشتعل کیا ہے کہ "وہ مسلمان ملیچھوں کے مقابلہ میں برطانیہ کی حکومت کو تسلیم کر لیں ان کا فرض ہونا چاہیے کہ ہندوستان کی پاک سرزمین کو ان ناپاک ملیچھوں سے صاف کر دیں۔ ان کی مسجدوں کو مٹا دینا چاہیے۔ اور ہر مسلمان کو زبردستی ہندو بنا لینا چاہیے" علاوہ اس کے مساجد وغیرہ اور اولیاء اسلام کے خلاف جو کلمات اس بنگالی کتاب میں درج ہیں نقل کرنا بھی ناقابل برداشت ہے۔

یہ کتاب ہندوؤں میں اور بالخصوص بنگالیوں میں وید کا درجہ رکھتی ہے اس کے خاتمہ پر مصنف نے یہ مشہور "بندے ماترم" کا گیت تصنیف کیا تھا کتاب کے آخر میں مسلمانوں کے خاتمہ کی دعا مانگی گئی ہے اور ان کی بادشاہت کے چلے جانے کی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ہندوستان کو دیوی تسلیم کر کے اس کی پوجا کے طور سے یہ گیت تصنیف کیا گیا ہے جس میں درگا اور مختلف دیویوں کے نام لیکر ان کی پوجا اور پرارتھنا کی گئی ہے اور ہندوستان کو مجسم بت تسلیم کر کے اور ہندوستانیوں کو پجاری مان کر بت کے سامنے التجائیں کیجاتی ہیں اس گیت کو سب سے پہلے ٹیگور نے عوام میں پڑھا اس کے بعد سے ہندوؤں نے اسکو قومی ترانہ بنا لیا۔

اول تو اس ترانے کی تصنیف جس کتاب میں کیگئی ہے اور جن فرقہ وارانہ اور غلامانہ ذہنیت کے ساتھ وہ کتاب اور یہ ترانہ بنائے گئے ہیں۔ نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ تمام ہندوستانیوں کے لئے تکلیف دہ ہے۔ دوسرے جو تخیل بت پرستی کا اس ترانے میں موجود ہے اس کو مسلمان نہ صرف پسند کرتے ہیں بلکہ ہر ایسے جلسے میں شرکت کو مذموم سمجھتے ہیں جس میں اس قسم کا گیت اور وہ بھی ہارمونیم کے ساتھ عورتوں کی زبانی گایا جائے۔ حال ہی میں کانگریس نے ان مسلمانوں کی درخواست پر جو کانگریس کے اندر داخل ہو کر کچھ کام کرنے کی

امیدیں رکھتے ہیں غور کیا لیکن بنگال کے ہندوؤں نے اس پر اپنی پوری فرقہ وارانہ اور تنگ نظری کا ثبوت دیا۔ مردوں اور عورتوں نے اس پورے ترانے کو پڑھتے ہوئے احتجاجی طور پر جلوس نکالے اور یہ دھمکی دی کہ اگر اس ترانے کو بدلا گیا تو ہم کانگریس سے علیحدہ ہو جائیں گے خود ٹیگور نے اس ترانے کی بیحد موافقت کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیچارے تمام کانگریسی مسلمان مایوس ہونے اور بت پرستی کے خیالات سے بھرا ہوا گیت بدستور قائم رہا صرف ان مسلمانوں کو بیوقوف بنانے کے لیے اس کے آخری حصہ میں سے کچھ کمی کر دی۔ خدا کے لیے اس قسم کے معمولی واقعات سے کانگریس زدہ ذہنیت کے مسلمان عبرت حاصل کریں کہ جب اندر داخل ہو کر اتنی معمولی بات کو نہ منوا سکے حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ ترانہ مسلمانوں کے لیے اسقدر تکلیف دہ ہے۔ تو پھر وہ کیسے امید رکھتے ہیں کہ اہم معاملات میں ان کی آواز کوئی اثر رکھ سکتی ہے۔ مسٹر ایم۔ این رائے نے اس مسئلہ پر بھی منصفانہ طور سے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"اس ترانہ پر مسلمانوں کی نکتہ چینی صحیح بنیادوں پر قائم ہے۔ گو یہ درست ہے کہ ترانے کے الفاظ سے کوئی بات مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس لگانے والی نہیں ہے تاہم جن واقعات سے اس ترانے کا تعلق ہے انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ترانے کا مصنف اسے ہندو مخالفین سے بغاوت کرنے والوں کی زبان سے ادا کرتا ہے جو کہ بت پرستانہ روح کے ساتھ ساتھ حقیقی معنوں میں بالکل ہندوانہ ہے۔ ایسی صورت میں کیا ہندو خیالات اور نظریوں کو زبردستی مسلمانوں پر عائد کرنے سے دو قوموں میں اتحاد و اتفاق پیدا کیا جا سکتا ہے؟" وطن کے معاملہ میں مسلمانوں کا تخیل بہت وسیع ہے۔ مسلمان وطن کو ہر گز بت بنا کر پوجنے کو تیار نہیں ہیں۔ مسلمان کا وطن کا تخیل ہندو تخیل سے بالکل جدا ہے۔

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

آج ہندوستان میں جو وطنی تحریک ہے وہ اسلامی تعلیم کے بالکل منافی ہے حب الوطنی دوسری شے ہے۔ لیکن اسلام کسی جغرافی حدود یا آب و ہوا کے امتیاز کا قائل نہیں ہے اس لئے مسلمان "قومی" نہیں بلکہ "بین الاقوامی" ہے۔ شعر

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہان نہ سمرقند

مسلمانوں کے عقیدہ کی رو سے خدا کی تمام زمین رسول کی مسجد ہے مسلمان دنیا کی تمام سرزمین میں آزادی پھیلانا چاہتے ہیں خواہ وہ ہندوستان ہو یا مصر موجودہ خالص تحریک "وطن" مذہب اور ملت کو تباہ کرنے والی شے ہے، یہ ایک ایسا بت ہے جس کو توڑنے کے لئے اسلام ظہور میں آیا تھا۔ ہجرت رسول "وطن" کی حدود کے خلاف کھلی ہوئی شہادت ہے مگر نئی تہذیب مغرب نے دنیا میں جہاں اور بت بنائے وہاں ایک بت "وطن" کا بھی بنا کر کھڑا کر دیا تاکہ دنیا میں امن اور صلح کبھی پیدا ہی نہ ہو سکے۔ شعر

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

بہر حال یہ سب معمولی باتیں تھیں مگر مسلمانوں کی آواز آج تک ارباب کانگریس پر مطلق اثر انداز نہ ہوگی۔

اور اگر فرض بھی کر لیا جاوے کہ اندر پہنچ کر کوئی آواز اثر کر سکتی ہے یا مشترک پارٹی میں مسلمان شرکت کر کے حقوق کی بہتر حفاظت کر سکتے ہیں تو وہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب مسلمان متفقہ اور متحدہ او من حیث الجماعت کانگریس کے قلعہ کو توڑ کر مردانہ وار داخل ہوں۔ اس کے لئے ہر حالت میں

مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر آنا پڑے گا اور انھیں تنظیم کرنی پڑے گی ورنہ یہ ایسی
موت ہوگی جس سے بچنا محال ہوگا۔ جمود و تعطل کبھی نہ کبھی دور ہو جاتا ہے۔ مگر خود
فراموشی کی موت کے بعد زندگی کا کوئی امکان نہیں انفرادی طور سے داخل
ہو جانے سے مسلمانوں میں انتشار اور باہمی نفاق کا برابر اضافہ ہوگا اور ملک
میں بہت سی مسلم جماعتیں برسرپیکار ہونگی۔ اور باہمی رزم آرائیوں میں
تمام طاقتیں صرف کریں گی۔ شعر

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

ان حضرات کو کم از کم یہ سوچنا چاہیے کہ اگر اسیطرح انفرادی حیثیت سے تفصیلی
سلبہ کی بنا پر مسلمان کانگریس میں داخل ہوتے رہے اور آئندہ چل کر جیسا یقینی ہے
کسی تصادم یا اختلاف رونما ہونے پر مسلمانوں کو گذشتہ مرتبہ کی طرح مستعفی
ہونا پڑا تو جو انتشار اور پریشانی کی حالت اس وقت رونما ہوگی اس کا اندازہ
اب نہیں ہو سکتا پچھلی مرتبہ جب مسلمان مجبوراً کانگریس سے علیحدہ ہوئے تھے تو آج تک
اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکے۔ اگر آئندہ بھی ایسا ہی ہوا تو پھر نہ معلوم مسلمانوں
کی تاریخ کتنی گہری دفن ہو جائے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

کانگریس کا شرمناک طرز عمل

جن لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ کانگریس رواداری کی حامی ہے۔ وہ مسلمانوں کو بہت
فراخدلی اور کشادہ پیشانی سے کانگریس میں لانے کے لئے اور ہر مفاہمت کیلئے تیار ہے
یہ تو مسلمان ہی غدار ہیں کہ وہ کانگریس میں آنا نہیں چاہتے اور ساتھ ہی ساتھ جن لوگوں
کی نصیحت یہ ہے کہ مسلمانوں کو بلا کسی شرط کے کانگریس میں شریک ہو کر وہاں اپنے
مطالبات پیش کرنا چاہیں اور اندر سے شور مچانا چاہیے ان کے لئے پہلی اور دوسری
اکتوبر کا کانگریس حکومت کا وہ متکبرانہ اور توہین آمیز طرز عمل باعث عبرت ہے

جس سے انھوں نے مسلمانوں کے متفقہ اور متحدہ مطالبہ کو ٹھکرا کر دنیا پر ثابت کر دیا
ہے کہ کانگریس کسی مفاہمت کے لئے ایک انچ بھی بڑھنا نہیں چاہتی۔

پہلی اور دوسری اکتوبر ۳۸ء کی گرما گرم بحثوں کے بعد اس فیصلہ کا وقت آیا جس کا
ہفتوں سے انتظار تھا۔ کانگریس نے دوسری اکتوبر کو پہلے مہاتما گاندھی کی یوم پیدائش
پر مبارکباد کا رزولیوشن پاس کیا۔ اس میں ہر مسلمان نے فراخدلی سے حصہ لیا اور مہاتما گاندھی
کی تعریف میں قصیدے پڑھے۔ اس کے بعد اس تجویز پر آخری بحث ہوئی جو کانگریس
نے رکھی تھی جس میں موجودہ قانون یعنی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو ہندوستان کی منشاء
کے خلاف ثابت کرتے ہوئے گورنمنٹ سے استدعا کی گئی تھی کہ ملک کا قانون بنانے کا
حق خود ملک کے ہی آدمیوں کو ہو جس میں ہر بالغ ہندوستانی حصہ لے سکے اور اس
جماعت کا نام کونسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی ہوگا۔ مسلمانوں نے اس کی تہ دل سے تائید کی
انھوں نے صاف اعلان کر دیا کہ ان کو اس تجویز سے پورا اتفاق ہے لیکن اس تجویز میں
اتنی ترمیم کر دی جائے کہ جب کبھی ایسی جماعت قائم ہو اسوقت مسلمانوں کو نمائندگی
کا حق کم از کم اتنا ہی رہے جتنا کہ اب ہے اور اس جماعت کو کوئی حق نہیں ہوگا کہ وہ
مسلمانوں کے مذہبی معاملات اور پرسنل لا یعنی نکاح اور طلاق اور وراثت کے مسئلوں
میں کوئی تبدیلی کر سکے جب تک کہ کم از کم تین چوتھائی مسلم ممبران ہم
آواز نہ ہوں۔

اول تو تجویز ہی مضحکہ خیز تھی ایسی کسی جماعت کا قیام ہی ہندوستان میں
نہیں ہو سکتا ہے جبتک مکمل انقلاب نہ ہو جائے۔ مکمل انقلاب سب سے زیادہ ضروری
اور اہم ہے اور اگر پہلے سے سوچ بھی لیا جاوے تو کانگریس کی رواداری اور انصاف
کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ فوراً اس ترمیم کو منظور کر لیتی بالخصوص اسوقت جب کہ وہ مسلمانوں کو
اپنے اندر آنے کی دعوت دے رہی ہے مگر نہ صرف یہ ہوا کہ مسلمانوں کے اس
متفقہ مطالبہ سے انکار کیا گیا بلکہ ان دونوں ایام میں جو تقریریں کانگریسی ممبران کی
ہوئیں وہ اس قدر دل شکن اور توہین آمیز تھیں کہ ہر مسلمان کو شرم کرنی چاہیئے،

کانگریس کی ہندوانہ ذہنیت ہر اس شخص کی تقریر سے ظاہر تھی جو اپنے آپکو غیر متعصب ہونے کا دعوی کرتا ہے کیا ان حالات کے باوجود کوئی یہ دعوی کرسکتا ہے کہ اندر گھس کر کوئی آواز اس ظالم اکثریت پر اثر کرسکتی ہے۔ اس سلسلہ پر مسلمانوں نے باہر سے نہیں بلکہ اندر ہی سے شور مچایا اور زور دار تقریریں کیں لیکن اس ہندو جماعت نے کیا اثر لیا؟ آخر کار سب مسلمان ممبران کو احتجاجاً باہر جانا پڑا سوائے تین کانگریسی ممبران اور ایک خان بہادر کے۔ شعر

گلگونہ عارض ہے نہ ہے رنگ حنا تو
اے خون شدہ دل تو تو کسی کام نہ آیا

جمعیۃ العلماء ہند اور شرکت کانگریس

شعر

نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑا اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

جمعیۃ العلماء ہند حضرت شیخ الہند مرحوم کی یادگار ہے۔ ہندوستان اور بالخصوص یو۔پی کے مسلمانوں نے اکثر جمعیت العلماء کا ساتھ دیا ہے۔ تحریک خلافت اور تحریک تبلیغ کے زمانوں میں مسلمان عوام نے ہمیشہ جمعیت العلماء کی آواز پر لبیک کہا ہے مگر بدقسمتی سے اغیار نے اس جماعت میں بھی تفریق پیدا کرادی۔ کانگریس کو معلوم تھا کہ علماء کا اثر عوام پر ہے۔ اور بالخصوص اطراف دہلی اور یوپی میں جمعیت العلماء کا کافی اثر ہے تو اس نے تمام امکانی کوششیں جمعیت العلماء کی مدد حاصل کرنے میں صرف کیں اس لئے کہ بغیر ان کی مدد کے رابطہ عوام کی جو سکیم ان دنوں میں ناکام ہو چکی تھی کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی تھی اور کانگریس کا مقصد مسلم عوام پر قبضہ کرنا تھا۔ علماء کی ایک جماعت کانگریس کے متکبرانہ طرز عمل سے خوب واقف تھی اس لیے

رائے یہ تھی کہ جب تک مسلمانوں کے حقوق کا معاہدہ کانگریس سے نہ ہو جائے اس وقت تک مسلمانوں کو کانگریس میں شریک نہ ہونا چاہیے۔ مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب غیر مشروط داخلہ کے خلاف تھے فرنگی محل کے تمام علماء اور جمعیت العلماء یو۔پی مکمل طور سے "شرکت کانگریس" کے خلاف تھے اور اب بھی ہیں اس لئے اغیار کی سکیم کامیاب ہوگئی کہ جمعیۃ میں بھی اختلاف اور انتشار پیدا کرا دیا جائے یہ افتراق اور خانہ جنگی جو ہندوؤں کی پیدا کردہ ہے میری ذاتی معلومات کا نتیجہ نہیں ہیں۔ بلکہ خود ناظم جمعیۃ العلماء کا بیان مورخہ ۱۴ اگست اس کی تصدیق کرتا ہے وہ علماء سے خطاب کر کے فرماتے ہیں۔

"کیا موجودہ پراگندگی اور شکست و تفریق کی حالت میں کوئی کام ہو سکتا ہے؟ یہ کام عوام کا نہیں ہے ان کا افتراق بھی بہت کچھ آپ کی تفریق کا نتیجہ ہے جس نے خود اس قسم کا موقع بہم پہنچایا ہے کہ وہ ہماری خانہ جنگی اور کاہلی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔"

بہر حال ہم کو جمعیۃ العلماء ہند کے اندرونی اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے اور اس بحث کو چھوڑتے ہوئے کہ حافظ محمد ابراہیم صاحب کے لیگ پارٹی سے استعفے اور قبول وزارت نے جمعیۃ العلماء کی پالیسی پر کتنا گہرا اثر ڈالا ہے اور ایک شخص نے پوری جماعت کی پالیسی کو کس حد تک متغیر کر دیا ہے۔ ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ جمعیت العلماء کا طرز عمل کیا رہا ہے کانگریس کے متعلق کیا رہا ہے اور وہ وقت بھی جمعیۃ العلماء کی کوئی تجویز ہے جس کی بنا پر بعض علماء انفرادی حیثیت سے شرکت کانگریس کی دعوت دے رہے ہیں۔ آیا ان کا ایسا کرنا محض انفرادی حیثیت رکھتا ہے یا کوئی جماعتی فیصلہ ان کی تائید کرتا ہے اور اگر جماعت کا کوئی فیصلہ ایسا نہیں تو پبلک خود اس بات کا اندازہ کر سکتی ہے کہ جماعت کے فیصلوں کے خلاف انفرادی حیثیت سے کوئی کام کیا حیثیت رکھتا ہے۔ جمعیۃ العلماء کے گزشتہ تمام کارنامے پبلک کے سامنے ہیں۔ حضرت شیخ الہند کی وہ یادگار تقریر ہمارے سامنے ہے جو آپ نے قیام جمعیۃ العلماء کے وقت کی تھی جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کو منظم رکھنا اور آزادی ہند کے لئے مسلمانوں کا خود منظم ہوکر کوشش کرنا کتنا ضروری ہے آپ کی

تمام تکالیف اور مصائب جو آپنے اسارت مالٹا میں برداشت کیں وہ صرف اسی خیال
کا نتیجہ تھیں کہ آپ ہندوستان میں خالص اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈلوانا چاہتے تھے
انکے دماغ میں بھی یہ بات نہ تھی کہ کانگریس یا کسی ہندو جماعت کے سہارے کی مسلمانوں کو
ضرورت ہوگی۔ قیادت کا تو کہنا ہی کیا ہے۔

آپ جب اسارت مالٹا سے واپس تشریف لائے تو آپ نے ساحل پر اترتے ہی
گاندھی جی کی جے کے نعرے سنے تو آپ نے بیحد حیرت اور استعجاب سے پوچھا کہ میں
تو "اللہ اکبر" کے نعرے ہندوستان میں چھوڑ گیا تھا۔ یہ اللہ کے بجائے گاندھی
کا نام کیسا۔" یہ کسی کا بنایا ہوا افسانہ نہیں ہے بلکہ واقعہ ہے خود میں نے اس کی
تصدیق مولانا عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری سے کی۔ یہی وجہ ہے کہ کانگریس
کے اصحاب تلک اور گوکھلے تک کا نام ہندوستان کی آزادی سے اتنا وابستہ
کرتے ہیں اور حضرت شیخ الہند کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔

تحریک خلافت آزادی ہند سے بہت گہری وابستگی رکھتی تھی مگر مسلمان
بحیثیت جماعت بالکل الگ تھے اور جب کہ کانگریس کمیٹیوں اور خلافت کمیٹیوں
کا کام ایک ہی ہوگیا تھا تو لوگوں نے مولانا ابوالکلام آزاد صاحب سے دریافت کیا کہ جب
کانگریس اور خلافت کمیٹیاں آپس میں مل گئی ہیں تو مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم اور خلافت
کمیٹیوں کی کیا ضرورت ہے تو مولانا نے آگرہ میں جمعیۃ العلماء کی صدارت کرتے
ہوئے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم تو ہندوستان کے آزاد ہونے کے
بعد بھی ضروری ہے۔ مسلمان ہر وقت اور ہر زمانے میں علیحدہ تنظیم قائم رکھیں گے
اگرچہ وہ اشتراک عمل دوسری جماعتوں سے کریں گے۔"

یہاں تک کہ ۱۹۴۲ء کی جنگ آزادی میں بھی جس کو جمعیۃ العلماء نے کانگریس سے
چار ماہ بعد تک لڑا۔ جمعیۃ العلماء نے مسلمانوں کی الگ جماعت رکھی اگرچہ اشتراک
عمل کانگریس سے تھا مگر مسلمانوں کی شرکت نہیں تھی جمعیۃ العلماء کے ڈکٹیٹر علیحدہ مقرر
ہوتے تھے اور سزا پاتے تھے مسلمان بحیثیت مسلمان آزادی کی جنگ میں شریک

تھے، کانگریس کے ہمدوش نبرد آزما تھے مگر جماعتی حیثیت سے بالکل الگ تھے۔

پھر مرکزی اسمبلی کے انتخابات کا جب زمانہ ۱۹۳۴ء میں آیا اسوقت بھی
جمعیۃ العلماء ہند نے مسلمانوں کی علیحدہ جماعت بنا کر الیکشن لڑنے کی تائید کی لہذا
لکھنؤ میں یونیٹی بورڈ قائم کیا گیا اور مسلمانوں سے کانگریس سے علیحدگی رکھتے ہوئے
رجعت پسند طبقہ کو ختم کرنے کے لئے الیکشن لڑا خود مولانا حسین احمد صاحب نے یونیٹی بورڈ
میں بیحد کام لیا۔ اس کے بعد جب ۱۹۳۶ء کے انتخابات کا زمانہ قریب آیا تو جمعیۃ العلماء
نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کو کانگریس سے باہر رکھ کر ان کی تنظیم کیجا دے اور مسلمانوں کی
علیحدہ جماعت بنا کر جداگانہ الیکشن لڑایا جائے۔

اس مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے جمعیۃ العلماء کے اس اجلاس میں جو زیر صدارت
مولانا حسین احمد صاحب دہلی میں منعقد ہوا۔ محمد علی جناح کو بلایا گیا انھوں نے وہاں تقریر
کی اور اپنی پوری پالیسی کو صراحت کے ساتھ بیان کیا کہ مسلمانوں کو علیحدہ رہ کر منظم
ہونے کی سخت ضرورت ہے۔ علماء نے اسکی تائید کی جمعیت العلماء کے اجلاس
کے بعد ہی فوراً بمبئی میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جسمیں ناظم جمعیۃ علمائے ہند خود تشریف
لے گئے اور وہاں اس تجویز کی تائید فرمائی کہ آئندہ الیکشن مسلمانوں کی جماعت
کے ماتحت علیحدہ لڑے جائیں اور جناح کی قیادت میں پارلیمینٹری بورڈ بننا چاہیے جس کا
مکمل اختیار سب کی رائے سے مسٹر جناح کو دیدیا گیا، لہذا مسٹر جناح نے تمام علماء
اور دوسرے صاحبان کو اس میں نامزد کیا، غضب یہ ہے کہ اس بورڈ میں ابتداءً نواب صاحب
چھتاری اور محمد یوسف صاحب تک کا نام تھا۔ لیکن باوجود اس کے
بھی مولوی حسین احمد صاحب نے اس میں شمولیت کا وعدہ کیا اور شامل ہوئے اور
ان لوگوں کی شمولیت سے کوئی اعتراض نہیں کیا اور اب جب کہ وہ طبقہ بالکل
الگ ہے مولانا لیگ سے متنفر ہیں۔

لہذا جب الیکشن کا زمانہ آیا تو مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب نے
لیگ اور مسٹر جناح کی پورے طور سے تائید کی۔ تمام قوت لیگ کی ہمدردی میں صرف

کی یہاں تک کہ مولانا حسین احمد صاحب نے مسٹر ظہیر الدین لاری گورکھپوری اور بعض دوسرے صاحبان لیگ کی ہمدردی میں یہاں تک فرمایا کہ جو لیگ کے خلاف ووٹ دیں گے ان کا دنیا اور آخرت میں کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ مسٹر ظہیر الدین کے خط میں تو مولانا نے صاف فرمایا ہے۔ کہ لیگ کی مخالفت کرنا اسلام کی مخالفت کرنا ہے قابل غور بات یہ ہے کہ اس الیکشن کے زمانے میں کانگریس نے سترہ امیدوار کھڑے کئے تھے۔ اور مولانا نے کسی امیدوار کی تائید لیگ کے مقابلہ میں نہیں کی تھی اور مولانا کے یہ الفاظ کہ "جو لیگ کی مخالفت کرے گا وہ دوزخ میں جائے گا" ہر اس جماعت یا شخص کے لئے تھے جو بھی لیگ کے خلاف جاتا خواہ وہ کانگریس ہو یا کوئی دوسری جماعت اور اب مولانا وہی الفاظ کانگریس کی ہمدردی میں فرما رہے ہیں۔ وہ لوگ جو پہلے الفاظ پر عمل پیرا ہو کر لیگ اور مسلمانوں کی ہمدردی پر آمادہ ہو گئے تھے وہ اب عجیب کشمکش و پیچ میں ہیں کہ کون سے قول پر ثابت قدم رہا جائے۔ بالخصوص چودھری خلیق الزماں صاحب اور مولوی محمد فاروق صاحب ممبران اسمبلی اور بعض دوسرے صاحبان ایسے ہیں جو صرف مولانا کے کہنے پر لیگ میں شامل ہوئے مولانا کے اس طرز عمل سے سخت پریشان ہیں چودھری صاحب نے اٹھارہ سال کی کانگریس میں اپنی قربانیوں کو بالائے طاق رکھ کر مولانا کے ہمدوش ہو گئے اور آج وہ بیچارے سخت حیران ہیں کہ مولانا کی یہ کیا پالیسی تھی کہ پہلے سب کو کانگریس سے کھینچ کر لیگ میں ملالیا اور اب خود علیحدہ ہو گئے

بہر حال ۱۹۳۷ء کے انتخابات تک علماء نے مسلمانوں کو علیحدہ رہ کر اپنی تنظیم کرنے اور رجعت پسند طبقہ کو ختم کرنے کا مشورہ دیا۔ کبھی کوئی تجویز اس طرح سے شرکت کانگریس کی تائید میں پاس نہیں کی اور نہ کانگریس کے ٹکٹ پر اسمبلی الیکشن میں کسی کو کھڑا کرنے کا مشورہ دیا، جیسا کہ اب حافظ ابراہیم صاحب کے معاملہ میں ہو رہا ہے۔ صرف یہیں تک نہیں۔ بلکہ انتخابات کے بعد بھی جب مسلمانوں کا رجحان کانگریس میں داخلہ کا دیکھا گیا تو جمعیۃ العلماء نے مرادآباد میں جو تجویز پاس کی اس سے

علماء کی پوری پالیسی سامنے آجاتی ہے۔ اس رزولیوشن کے دو حصے تھے ایک حصہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ جہاں تک جنگ آزادی کا تعلق ہے جمعیۃ العلماء کے سامنے شرکت یا عدم شرکت کانگریس کا کوئی سوال ہی پیش نہیں ہے۔ جمعیۃ نے ہمیشہ کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کیا ہے۔ دوسرے حصہ میں بالکل صاف درج ہے کہ "جب کوئی جمہوری حکومت جزوی یا کلی ملک میں نافذ ہو تو جب تک اکثریت اقلیت کے حقوق ملی و مذہبی کی حفاظت کا پورا اطمینان نہ دلائے اس وقت تک شرکت نہیں ہو سکتی جمہوری حکومت آجکل جزوی طور سے مل رہی ہے۔ اقلیت اکثریت کے سامنے حقوق کا مطالبہ بار بار پیش کر رہی ہے۔ لیکن اکثریت ٹھکرا رہی ہے۔ پھر اس رزولیوشن کے بموجب شرکت کانگریس کا سوال ہی نہیں آتا۔ رہا آزادی کی جنگ کا معاملہ بیشک جمعیۃ نے کانگریس میں شرکت کبھی نہیں کی لیکن اشتراک عمل کیا ہے۔ لیکن آج ملک میں کوئی جنگ آزادی نہیں ہے۔ کانگریس اور حکومت کا باہمی تعاون ہے۔

اس سلسلہ میں مولانا احمد سعید صاحب کا بیان مورخہ ۲۴۔ اگست قابل غور ہے آپ نے فرمایا ہے۔

"ہم نے ہمیشہ صاف صاف اس امر کا اعلان کیا ہے کہ ہم بھی جنگ کرنے والی پارٹی کے ساتھ اشتراک عمل کریں گے خواہ وہ کانگریس ہو یا سوشلسٹ یا کمیونسٹ ہو فرض کیجئے کہ اگر کانگریس اپنے ہتھیار کھول دے اور حکومت برطانیہ سے تعاون کرے تو کیا ہم کانگریس کے ساتھ الجھے رہیں گے نہیں بلکہ ہم کسی ایسی پارٹی کو تلاش کریں گے جو ہمارے حقیقی مقصد یعنی مکمل انقلاب کو ہم سے قریب کرنے والی ہو۔ ہماری کوشش تو ہمیشہ یہ رہی ہے اور ہم ہمیشہ اس قوت و طاقت کی تلاش میں رہے ہیں جو بدوں شرکت غیرے ہم کو منزل مقصود تک پہنچا دے"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جمعیۃ العلماء نے آزادی ہند کو بلا شرکت غیرے

حاصل کرنے کو اپنا نصب العین رکھا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بے بسی اور مجبوری
کی حالت میں دوسری پارٹی سے اشتراک عمل بھی کیا ہو لیکن اب جب کہ بقول
مولانا کے اس پارٹی نے اپنے جنگ کے ہتھیار رکھ دئیے ہیں تو پھر جمعیت کے
بعض علماء اس کے ساتھ کیوں الجھ رہے ہیں؟ یہ الفاظ کہ کانگریس جنگ آزادی
کو چھوڑ چکی ہے۔ خود مولانا کے پاس بیان کے دوسرے جزو میں ہیں آپ نے
صاف صاف اقرار کیا ہے۔

"مستقبل قریب میں جنگ کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ کانگریس اور حکومت
دونوں باہمی تعاون اور اشتراک عمل کی پالیسی پر عامل ہیں" اس بیان کے
بعد سمجھ میں نہیں آتا کہ شرکت کانگریس کی دعوت کس بنا پر دی جا رہی ہے۔
اس بیان سے پیشتر بھی اجلاس مراد آباد کے قریب ہی مولانا احمد سعید صاحب کا
ایک اور بیان شائع ہوا تھا۔ جس میں انھوں نے بہت مدلل طریقہ پر ثابت کیا
تھا کہ جب کانگریس حکومت سے اپنے تحفظ کے لئے اطمینان کی درخواست
کر رہی ہے تو مسلمان اگر کانگریس سے اپنا مطالبہ پورا کرنا چاہیں تو کیا بیجا ہے
ایسی صورت میں جب کہ جماعت کا فیصلہ صاف طور سے موجودہ حالات میں
کانگریس میں داخلہ کے خلاف ہے، جب تک کہ کانگریس مسلمانوں کی شرائط نہ
تسلیم کر لے تو یہ سخت حیرت و افسوس کا مقام ہے کہ خود اسی جماعت کے ممبران
اپنے ہی فیصلہ کی خلاف ورزی کرنے میں مصروف ہیں۔

حضرت مولانا قطب الدین عبدالوالی صاحب فرنگی محلی،
صدر جمعیت العلماء یوپی کا بیان مورخہ ۱۷ نومبر ۴۳ء اس حقیقت کا پورا انکشاف کر رہا ہے
آپ فرماتے ہیں

"چند روز سے بعض مسلمان جو اپنی قوم کے مفاد کا خیال کئے بغیر ملازمتوں

ٹھیکیداریوں، وزارتوں اور صدارتوں یا غلط فہمیوں اور ذاتی جھگڑوں کی وجہ
سے بلا شرط اپنی تنظیم کئے بغیر کانگریس میں شریک ہو رہے ہیں اور مسلمان
عوام کو بھی اپنے ساتھ کانگریس کی نفسانی قوتوں پر قربان کرنا چاہتے ہیں، طرح
طرح کے پروپیگنڈے مسلمانوں میں کر رہے ہیں۔ انھیں میں سے بعض نے کہا کہ
جمعیۃ العلماء ہند دہلی کانگریس کے ساتھ ہے۔ میں بہ حیثیت صدر جمعیت العلماء صوبہ
متحدہ (دہلی) یہ صاف ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ جمعیت نے ہرگز ہرگز کانگریس میں
ضم ہو جانے اور شریک ہونے کا فیصلہ نہیں کیا ہے اور نہ وہ مسلمانوں کو بلا شرط
شرکت کا مشورہ دیتی ہے یہ بات اور ہے کہ جمعیت کے بعض اراکین مثلاً مولانا
حسین احمد صاحب بلا معقول سبب بتائے ہوئے انفرادی طور پر کانگریس میں
شریک ہو گئے ہیں۔ مگر ان حضرات کی شرکت کسی طرح جمعیت کی شرکت
نہیں کہی جا سکتی جمعیت میں بہت سے ایسے اشخاص موجود ہیں جو کانگریس کی
موجودہ اقلیت کشی اور حکومت پروری کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں
اور مسلمان نمائندہ جماعت مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔ میں کانگریس کا حامی تھا۔
اسوقت تک جبتک کہ اس کی جنگ انگریزوں سے تھی اور اس کی جد و جہد ہندوستان کی
کی آزادی اور سربلندی کے لئے تھی۔ مگر آج جب اس کی تمام قوتیں
اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کے مٹانے اور ان کی جماعتوں میں انتراق ڈالنے
اور مذہبی خیالات برباد کرنے میں مصروف ہو رہی ہیں اور اس کی تمام جد و جہد
آزادی ہند کے بجائے صرف اپنی قوت بڑھانے کے لئے ہے مسلمانوں کو کانگریس
کے اثرات سے بچانا ضروری سمجھتا ہوں اور مسلمانوں سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ
مسلم لیگ کو مضبوط کر کے ہر اس جماعت سے مقابلہ کے لئے تیار ہو جائیں جو
ان کی سیاسی اور مذہبی حیثیت ہندوستان یا دبانے کی ملک سے مٹانے کے
درپے ہو"

بد قسمتی سے بعض چند حضرات نے مسلم لیگ کے غلط واقعات اور کانگریس کی

پالیسی کو چلا دیکر مولانا حسین احمد صاحب کو بھی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا اور ان کو اس بات پر آمادہ کر لیا ہے کہ وہ لیگ کی مخالفت اور کانگریس کی شرکت پر زور دیں، حالانکہ لیگ کے اندر تازہ روح پھونکنے والوں میں خود مولانا بھی شریک تھے مولانا موصوف کی جو عزت میرے دل میں ہے وہ انشاءاللہ ہمیشہ رہے گی۔ مگر سیاست کمبخت ایسی چیز ہے کہ اس میں تقدس اور بزرگی کے اوپر بسا اوقات چالبازی اور عیاری غالب آجاتی ہے۔ شعر

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم

بدقسمتی سے یہاں یہی ہوا۔ غلطیاں ہر بڑے سے بڑے آدمی سے ہو سکتی ہیں گاندھی اور جواہر لال اور محمد علی جناح تک نے بڑی بڑی غلطیاں کیں جن کو بعد میں انھوں نے خود محسوس کیا۔ سوائے انبیاء علیہم السلام کے ہر شخص غلطی کر سکتا ہے اسلامی سیاست کا یہ بہترین اصول ہے کہ اگر کوئی بالغ مسلمان نیک نیتی سے کسی عمل کو غلط سمجھے اور اس کے خیال میں وہ عامۃ المسلمین کے مفاد کے خلاف ہو تو خواہ وہ عمل کیسی ہی بزرگ ہستی سے سرزد ہوا ہو خواہ وہ خلیفہ ہی کیوں نہ ہو اس کو غلط مان کر اپنی رائے کو چھپا لینا سخت گناہ ہے۔

مولانا سے جو اختلاف تھا میں نے خود مولانا کے سامنے بذریعہ خط پیش کر دیا اور خدا کا شکر ہے کہ مولانا نے اس سے جزوی اختلاف فرمایا مگر میری رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔ میں ذیل میں مولانا کے اس خط کے ایک ضروری حصہ کو نقل کرتا ہوں جو آپ نے دیوبند سے ۲۳ ستمبر کو میرے خط کے جواب میں ارسال فرمایا۔

"والا نامہ باعث سرفرازی ہوا یادآوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں آپ کے خیال سے متفق ہوں کہ مسلمانوں کی ضرور تنظیم ہونی چاہیے مگر خداوندان لیگ پر مجھ کو بالکل اعتماد نہیں رہا"

جن لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ کن کن صورتوں سے مولانا کے سامنے بالکل غلط واقعات

پیش کئے گئے وہ مولانا کے موجودہ طرز عمل سے زیادہ شاکی نہیں ہیں البتہ اتنا افسوس ضرور ہے کہ مولانا نے ان واقعات کی تصدیق نہیں کی اور ان نفاق پیدا کرانے والے حضرات کے اقوال کا اعتبار کر لیا۔

خود مجھے امید ہے کہ جب کبھی بھی مولانا ان واقعات کا مطالعہ فرمائیں گے تو مولانا لیگ میں تشریف لائیں گے اور مجھے تو یقین ہے کہ کانگریس کا موجودہ طرز عمل خود مولانا کو بہت جلد مجبور کرے گا کہ وہ بھی مولانا محمد علی کی طرح استعفیٰ دیں۔

مولانا محمد علی مرحوم کے ایثار اور قربانیوں کی داستان مٹنے والی نہیں ہے مگر کانگریس کے مسلم کش اور متکبرانہ طرز عمل سے مجبور ہو کر انھوں نے بھی استعفیٰ داخل کیا اور غضب یہ ہے کہ موتی لال آنجہانی کی جبین پر شکن تک بھی نہیں پڑی تھی جب مولانا محمد علی مرحوم نے استعفیٰ داخل کیا) مولانا حسرت موہانی وہ مایہ ناز فرد ایثار اور قربانی کا مجسمہ ہیں جن کو گاندھی بھی نہیں بھلا سکتے مولانا ظفر علی خان صاحب مولانا حسین احمد صاحب کے دوش بدوش جیل میں رہنے والے بزرگ ہیں مسجد شہید گنج کی پوری تحریک آپ ہی کی قیادت میں ہوئی سرحد کی جنگ میں آپ نے جو خدمات کیں ان کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ محمد علی جناح خود کانگریس کے سرگرم ممبر تھے۔ مگر ان سب کو استعفے داخل کرنے پڑے۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ مولانا اس متکبر جماعت میں عرصہ تک رہ سکیں ہاں اگر وہ اپنا طرز عمل آج بدل دے تو تمام مسلمان جانے کو تیار ہیں۔

خود مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب کانگریس کی شرکت اس وقت مفید نہیں سمجھتے جب تک کہ کانگریس اپنے متکبرانہ طرز عمل سے باز آجاوے جماعت احرار نے جماعتی حیثیت سے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ صدر احرار کا جو بیان ملتان اور ڈیرہ اسمعیل خان سے جماعت کی طرف سے شائع ہوا اس میں صاف لکھا ہے کہ مسلمانوں کی شرکت کانگریس کا معاملہ بہت اہم ہے اس لئے ابھی غور کرنا چاہیے۔ خود مولانا عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری نے لکھنؤ

احرار کانفرنس میں صاف صاف فرمایا "کہ مسلمانوں کے لئے کانگریس میں کوئی
گنجائش نہیں ہے۔ کانگریس کی رفتار ساڑھے تین میل فی گھنٹہ ہے اور مسلمان کی
رفتار بیس میل سے کم ہو ہی نہیں سکتی۔"
دہلی میں مسجد فتحپوری میں انھوں نے ۲۷۔ اگست کی شب کو ساٹھ ہزار کے
مجمع میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "مسلمانوں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہئے انکو
چاہیے کہ وہ کانگریس کا سہارا نہ لیں۔ گاندھی اور جواہر لال کو اپنا پشت پناہ نہ
سمجھیں۔ ان سے کوئی فائدہ مسلمانوں کو نہیں پہنچ سکتا۔ گاندھی اور جواہر لال انگریز
کی نسلیں ہیں۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ چاہی نہیں" پوری تقریر ۳۱۔ اگست کے
قومی گزٹ میرٹھ میں شائع ہوئی ہے۔ لیکن ان تمام تقریروں اور بیانات کے
باوجود احرار کا طرز عمل ناقابل فہم رہا ہے۔ کبھی وہ کانگریس کی کھلم کھلا مخالفت
کرتے ہیں اور کبھی کانگریس کے ہمنوا بنجاتے ہیں۔ اگرچہ ان کی جماعت نے
شرکت کانگریس کے متعلق کچھ طے نہیں کیا ہے مگر اس کے ممبران انفرادی طور
سے شرکت کی دعوت دے رہے ہیں۔ جہاں تک جناب مولنا
حسین احمد صاحب کی شخصیت کا تعلق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ
جوش عمل اور دیانت اور ایمانداری میں مولانا حسین احمد صاحب کی ہستی ہندوستان کے
مسلمانوں میں قابل تقلید ہے۔ جواہر لال اور گاندھی لاکھ کہا
کریں مگر جس تخیل آزادی کے مالک مولانا ہیں وہ ان کے
نصیب میں کہاں؟ لیکن ساتھ ہی مولانا نہایت سیدھے
اور سیدھے سادھے مسلمان ہیں اغیار کی شاطرانہ اور عیارانہ سیاسی چالیں انکو
مغالطہ میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ وہ جیسے خود راست گو اور پاکباز مسلمان ہیں دوسروں
کو بھی ویسا ہی سمجھتے ہیں اور ان کی باتوں کو سچ سمجھ لیتے ہیں۔ کانگریس
ان کے سامنے کہتی ہے کہ وہ آزادی کی علمبردار ہے وہ ہندوستان کو آزاد
کرانا چاہتی ہے۔ تو مولنا سمجھ لیتے ہیں کہ واقعی کانگریس ایسا ہی

چاہتی ہے، حالانکہ واقعات اور روایات اس کے بالکل خلاف ہیں۔ میں مولانا سے
درخواست کروں گا کہ جو اقتباسات میں نے اپنے اس ثبوت میں گزشتہ صفحات میں پیش کئے
ہیں کہ کانگریس کے دل میں آزادی ہند کا تخیل بھی نہیں ہے وہ صرف ہندو حقوق زیر
سایہ برطانیہ" چاہتی ہے ان پر ایک نظر ڈالیں اور غور فرمائیں کہ کون سی بات میرے دعوی
کی تردید کرتی ہے۔

غضب یہ ہے کہ کانگریس کے ارباب اقتدار مولانا کے سامنے دست بستہ اور خوشامدانہ
طریقوں سے پیش آتے ہیں بہ ظاہر وہ علماء کی بہت قدر کرتے ہیں جواہر لال بھی انکو
خدا کے دیوتا" کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ اس سے مولانا خیال کرتے ہیں کہ خود کانگریس کا طرز عمل
عام مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی ہوگا۔ لیکن چونکہ عامۃ المسلمین کے سامنے کانگریس اپنے اصلی روپ
میں آتی ہے اس لئے کہ عوام کی خوشامد کی انکو ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عوام
کانگریس کی ذہنیت سے زیادہ واقف ہو گئے ہیں۔ خود کانگریس کے وہی اصحاب جو
علماء کی بوقت ضرورت عزت کرتے ہیں مذہب کے سخت دشمن ہیں ستیہ مورتی جو کانگریس پارٹی کے
اسمبلی میں چیف وہپ ہیں ان کے وہ الفاظ کس قدر دلشکن ہیں جو انھوں نے گزشتہ
آل انڈیا بجٹ کی بحث میں مسلمانوں کو جواب دیتے ہوئے کہے تھے کہ:۔

"ایک زمانہ وہ آنے والا ہے کہ اسلام کا نام لینے پر مسلمان خود آپ کا
مذاق اڑائیں گے۔ آپ بیسویں صدی میں مذہب کی باتیں کرتے ہیں۔"

خود جواہر لال اور دوسرے کانگریسی لیڈر علماء کانگریس کو معمولی سی اہمیت بھی دینے
کو تیار نہیں ہیں۔ اگر جواہر لال اور کانگریس کے دل میں حقیقی معنوں میں علماء کی قدر ہے تو آخر
کیا وجہ ہے کہ گاندھی باوجودیکہ کانگریس کے چار آنے کے ممبر بھی نہیں ہیں لیکن کوئی قدم انکے
بغیر نہیں اٹھایا جا سکتا اور علماء سے کبھی کوئی بات سیاسی یا مذہبی معلوم ہی نہیں کیجاتی۔ کیا کبھی
کسی اہم مسئلہ میں مثلاً قبول وزارت یا فیڈریشن وغیرہ وغیرہ میں جواہر لال نے مفتی صاحب اور
مولانا حسین احمد صاحب سے کبھی بھی کوئی مشورہ کیا؟ جس طرح واردھا میں ہمیشہ گاندھی آشرم کا طواف
کرتے ہیں کبھی اپنی عمر میں دیوبند تشریف لیجا کر انھوں نے مولانا حسین احمد صاحب کو کوئی مشورہ

کیا حالانکہ وہ ۱۹۳۶ء سے کانگریس کے ممبر ہیں۔

عزت اور مشورہ کا تو سوال درکنار رہے۔ ہماری بدقسمتی تو یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ہمارے مقتدر علماء اور رہنماؤں کو کانگریس محض آلۂ کار سمجھتی ہے۔ ان سے وہ سیاست کے کسی پہلو میں مشورہ کی ضرورت نہیں سمجھتی بلکہ جب عوام سے کام لینا پڑتا ہے تو ان کو آلۂ کار کی طرح استعمال کرتی ہے۔ جو ہر مسلمان کے لئے تکلیف دہ اور باعث شرم ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا وہ خط کس قدر عبرت انگیز اور سبق آموز ہے جو انھوں نے وردھا سے جھانسی کے الیکشن کے وقت ۵ جولائی ۱۹۳۷ء کو رفیع احمد قدوائی کے نام لکھا تھا وہ خط اتفاق سے بجائے رفیع احمد قدوائی کے رفیع الدین کو مل گیا۔ اس خط کو خود پنڈت جی نے بذریعہ ڈاکٹر اشرف صاحب ۲۷ ستمبر ۱۹۳۷ء کے "انصاری" میں شائع کرایا ہے

وہ خط انگریزی میں تھا جس کی تصویر شائع ہو چکی ہے اس کا ترجمہ ڈاکٹر اشرف صاحب نے "انصاری" میں شائع کرایا ہے وہ اصل خط سے کچھ مختلف ہے لیکن اگرچہ انھوں نے مضمون کے مفہوم کو کچھ بدل لیا ہے مگر حقیقت سامنے آ ہی گئی ہے میں خود انھیں کے ترجمہ میں سے ایک حصہ کو نقل کرتا ہوں اور عوام پر یہ فیصلہ چھوڑتا ہوں کہ کانگریس علماء کو کس نظر سے دیکھتی ہے۔

یہ واضح رہے کہ یہ خط جھانسی کے الیکشن کے متعلق ہے جس میں علماء کو محض آلۂ کار کی طرح بلایا گیا۔ الفاظ یہ ہیں۔

"جہاں تک کام کرنے والوں کا تعلق ہے ایک اچھی تعداد باہر سے پہنچا دی گئی ہے۔ ابوالکلام آزاد نے حسین احمد اور بشیر احمد کو اطلاعات پہنچا دی تھیں اس نے احمد سعید کو بھی تار دے دیا تھا۔ ان لوگوں کو اخراجات سفر ملنا چاہئیں ہم کچھ مالی امداد کرنے کی کوشش کریں گے مجھے یقین ہے کہ سات سو روپے پہلے اس الیکشن میں دیا جا چکا ہے۔"

روپے، مالی امداد اور اخراجات کے سوال کو قطع نظر کیجئے

خود جواہر لال کے شائع کردہ خط سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا طرز عمل مولانا کے ساتھ کیسا ہے۔ ان کے نام کے ساتھ یا مولانا احمد سعید صاحب کے نام کے ساتھ "مولوی" یا "صاحب" تک بھی نہیں ہے اور ان کے متعلق لکھا ہے کہ "باہر سے کام کرنے والوں کی اچھی جماعت پہنچا دی گئی ہے"۔

خدا کے لئے علماء اپنی پوزیشن پر غور فرما دیں اور کانگریس کی ان توہین آمیز حرکتوں کا منہ توڑ جواب دیں۔ دوسری طرف پنڈت جی کے لئے بھی مناسب نہیں ہے کہ وہ اس طرح ایک عالم کو آلۂ کار سمجھیں اور ان کے متعلق اس قدر توہین آمیز الفاظ تحریر فرما دیں۔

ایسا کیوں ہے کہ کانگریس ہمارے علماء کو آلۂ کار کیوں سمجھتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے علماء جنھوں نے ہمیشہ دنیا کو اپنے پیچھے چلایا ہے جنھوں نے دوسری جماعتوں کی قیادت اور رہنمائی کی ہے وہ عرصے سے کانگریس کے ہر کام کی تائید میں مصروف ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ کانگریس کی تمام جدوجہد اور کوششیں مسلم کشی اور ہندوؤں کی ترقی میں صرف ہو رہی ہیں ان کو معلوم ہے کہ کانگریس میں نہ صرف ہندوؤں کی اکثریت ہے بلکہ وہ ہندو مہا سبھا کی دوسری تصویر ہے وہ اس سے بھی بے خبر نہیں ہیں کہ کس طرح مسلمانوں کو ۱۹۲۲ء کے بعد کانگریس سے باہر آنا پڑا۔ ان کے سامنے اپنی گذشتہ تاریخ اور قائدے بھی ہیں کہ انھوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رکھا۔ اشتراک عمل کانگریس سے ضرور کیا۔ مگر مسلمانوں کی علیحدہ جماعت قائم رکھ کر۔ لیکن ان تمام معلومات کے باوجود وہ کانگریس کے ہر کام کے مؤید ہیں۔

اگر یہ تقلید محض نہیں تو کیا ہے کہ جمعیۃ کے بعض علماء کی پالیسی میں گذشتہ چار ماہ میں بالخصوص حافظ ابراہیم کے لیگ سے مستعفی ہو جانے کے بعد

سے اب تک کتنا تغیر رونما ہو چکا ہے۔ اب وہ صرف اس لئے مسلمانوں کو کانگریس میں بھیجنے کی سعی بلیغ میں لگے ہوئے ہیں کہ کانگریس نے رابطہ عوام کمیٹی کے ذریعہ سے نئی جد و جہد شروع کر دی ہے۔ یہی تقلید اور طرز عمل کا تغیر ہمارے علماء کو کانگریس کی نظر میں کم حیثیت بنائے ہوئے ہے۔ طرز عمل کے تغیر کی یہ حالت ہے کہ جب کانگریس نے نمک سازی کی تحریک شروع کی تو نمک پر محصول لگانے کے خلاف فتوے دے گئے۔ جب کانگریس نے اسمبلیوں میں جانا چاہا تو اسمبلی جانے کی تائید کی گئی اور جب اس سے قبل سوراج پارٹی نے اسمبلیوں کا بائیکاٹ کیا تھا تو حضرات علماء نے اسمبلیوں میں جانا ناجائز تبلایا تھا اب جب پھر کانگریس اسمبلی میں داخل ہے تو اسمبلیوں کے داخلہ کو جائز فرما رہے ہیں۔ یہاں تک کہ وزارتوں کو قبول کرانے میں بھی مددگار ہیں، حافظ ابراہیم صاحب کی وزارت اس بات کی شاہد ہے۔ میرے پاس علماء کے وہ تمام فتاوے محفوظ ہیں۔ جن میں انھوں نے ترک موالات کی تحریک کے زمانے میں ہمیشہ کے لئے کونسلوں اور اسمبلیوں کے داخلہ کو حرام تبلایا ہے۔

حضرت شیخ الہند صاحبؒ نے مالٹا سے واپس آتے ہی فتویٰ شائع کیا کہ ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کیا جاوے حضرت شیخ الہند کا پورا فتوے "ترک موالات" نامی کتاب کے صفحہ ۲ پر درج ہے یہ کتاب مدینہ پریس میں چھپی تھی۔ جس میں آپ نے کونسلوں سے علیحدگی اور سرکاری خطابات کو واپس کرنے کو ملی فرض سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس کے بعد دوسرے فتوی میں آپ نے احادیث اور قرآن مجید سے ثابت کیا ہے کہ کونسلوں میں جانا کس طرح حرام اور معصیت ہے یہ مولانا کی ذاتی رائے تھی۔ اب جمعیۃ العلماء کا متفقہ فتوے ملاحظہ ہو۔ جس کو اگر ہم "اجماع امت" کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ اس میں سب وہی حضرات شامل ہیں جو آج کونسلوں میں

جانے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ اس فتوے میں علماء نے صاف مندرجہ ذیل الفاظ میں حکم صادر فرمایا تھا کہ:-

کونسلوں کی ممبری سے علیحدگی اور امیدواروں کے لئے رائے نہ دینا واجب العمل ہے۔ کیونکہ گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ موالات کے تمام تعلقات اور معاملات رکھنے حرام ہیں۔

اسی فتوی میں کونسلوں کے بائیکاٹ اور اسمبلیوں وغیرہ کی شرکت کو حرام کرنے کے وجوہ بیان کئے گئے ہیں جن میں سے بعض میں بجنسہ نقل کرتا ہوں:-

(الف) کونسل قانونی ہو یا انتظامی (یعنی اسمبلی یا وزارت وغیرہ) اس کا مقصد نظام حکومت کا استحکام و انصرام ہے جو کھلم کھلا حکومت کی معاونت ہے

(ب) کونسل میں اکثر غیر شرعی قانون وضع کئے جاتے ہیں جن کی تحریک یا تائید اس پر سکوت باوجود قدرت مخالفت کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ۔ مگر مسلم ممبران یہ سب کچھ کرتے ہیں جس کے شواہد واقعات ماضیہ اور خود موجودہ قوانین کا نفاذ ہے۔

(ج) کونسل میں انگریزی قوم بھی ہوتی ہے جو ظالم و دشمن دین ہے اور ایسی قوم کے ساتھ اعزازی نشست شرعاً حرام ہے اللہ تعالی فرماتا ہے فلا تقعد بعد الذکری مع القوم الظالمین (سورہ انعام) ترجمہ:- پس یاد آنے کے بعد ظالموں کے ساتھ مل کر نہ بیٹھو۔

(د) کونسل میں ممبران کے لئے حکومت کی وفاداری و اطاعت شعاری اور بہی خواہی ضروری ہے اور حالات موجودہ میں اپنی خوشی اور اختیار سے حکومت کی وفاداری و اطاعت شعاری و بہی خواہی مسلمانوں پر حرام ہے اس لئے وفاداری کی قسم شرعاً حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔

اس فتویٰ کو بہ غور پڑھئے اور سوچئے کہ کیا علماء اس پر اب عمل پیرا ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ فتوے کہاں تک ممکن العمل ہے اور کب تک اس پر عمل پیرا ہوا جا سکتا تھا۔ مگر مجھے صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ علماء نے اس فتوے کو صادر کرتے وقت آنے والے واقعات پر ضرور غور کیا ہوگا خود شیخ الہند صاحب مرحوم نے آنے والے خطرات کے متعلق آگاہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ کونسلوں کی ممبری وغیرہ ہونے کے لئے ضروری ہے۔ ممکن ہے درمیان میں کچھ نقصان اٹھانا پڑے مگر آخر میں یہی مفید ہوگا۔ پھر میں انہیں علماء سے جنھوں نے یہ فتوے صادر فرمایا تھا اور کانگریس کی شرکت کے داعی ہیں کیا ادب دریافت کر سکتا ہوں کہ آخر وہ کون سے حالات بدل گئے ہیں جن کی بناء پر ان کو کانگریس کی تقلید میں کونسلوں اور وزارتوں کو قبول کرنے کی اجازت دینا پڑی۔ کیا اب یہ کونسلیں انصرام حکومت میں تعاون کا ایک قدم نہیں ہے۔ وزیر باقاعدہ تنخواہ دار ملازم ہے یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں حافظ ابراہیم صاحب ممبر بھی نہیں ہیں اور صرف ملازم ہیں۔ پھر کیا یہ تعاون نہیں ہے کیا اب غیر شرعی قوانین سود وغیرہ کے وضع نہیں کئے جاتے۔ کیا اب کونسل میں انگریز قوم نہیں ہوتی اور ظالموں کے ساتھ مل کر بیٹھنا نہیں پڑتا اور کیا اب حلف وفاداری "بغیر کسی کے مجبور کئے ہوئے اٹھانا نہیں پڑتا! آخر وہ کون سے واقعات ہیں کیا جزائر العرب اور بیت المقدس آزاد ہو گئے ہیں۔ یا برطانیہ نے مسلمانوں سے صلح کر لی۔

کیا دہلی کا لال قلعہ اور تاج محل آزاد ہو گئے ہیں اور کیا اسلام آزاد ہو گیا ہے! اور اگر نہیں تو پھر کیا حیرت و استعجاب کا مقام ہے کہ ہمارے علماء پہلے تو اس قسم کے فتوے صادر فرماتے ہیں اور پھر جب کانگریس اسکے خلاف عمل پیرا ہوتی ہے تو وہ خود بھی اپنے ہی فتووں کو فراموش کر دیتے ہیں

یہی وجہ ہے کہ کانگریس اور کانگریس کے صدر ہمارے علماء کو ان توہین آمیز الفاظ

سے یاد کرتے ہیں، اختلاف رائے دوسری شے ہے مگر میں کم از کم اس بات کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوں کہ اس زمانے میں علماء کی قدر و منزلت اس طرح گرائی جاوے۔ میں مولانا احمد سعید صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اولین فرصت میں اس قسم کی شرمناک اور توہین آمیز حرکات کا تدارک کریں۔

امام الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب قبلہ کا ارشاد گرامی!!

ذیل میں مولوی احسان الحق صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ سکریٹری جائس مسلم لیگ الہ آباد کا وہ خط اور اس کا جواب بجنسہٖ شائع کیا جاتا ہے کہ جو انہوں نے امام الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب کی خدمت میں موجودہ سیاسی صورت حال کے متعلق استصواب رائے کی غرض سے روانہ کیا تھا۔

جائس مسلم لیگ الہ آباد

مخدومی مولانا اشرف علی صاحب مد ظلہ العالی۔ بعد سلام مسنون آنکہ۔ مدعائے نگارش آنکہ خاکسار بحیثیت خادم قوم بمقام جائس ضلع الہ آباد مسلم لیگ کے جانب سے کام انجام دے رہا گشت میں اکثر آپ کے مریدین فرماتے ہیں کہ تاوقتیکہ مولانا صاحب اپنے خیال کا اظہار نہ کریں ہم لوگ مسلم لیگ میں شرکت کرنے سے قاصر ہیں۔ ایسی صورت میں بحیثیت سکریٹری جائس مسلم لیگ نیز بطور ایک عقیدتمند مسلمان کے آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ آیا آجکل مسلمانوں کے لئے مسلم لیگ میں شرکت کرنا مناسب ہے یا کانگریس میں۔ براہ کرم اپنے خیالات سے خاکسار کو ارشاد فرمائیے اور ممنون و مشکور کیجئے۔ اگر مسلم لیگ اسلامی حقوق کا تحفظ نہیں کر سکتی ہے تو کیا اس میں شرکت کرنا مناسب ہوگا۔ ورنہ ضرور بالضرور شرکت کرنا چاہئے۔ امید ہے کہ آپ جواب جلد سے جلد ارشاد فرماویں گے۔

احقر احسان الحق ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ ایڈوکیٹ سکریٹری جائس مسلم لیگ الہ آباد نمبر ۲، نخاس کہنہ الہ آباد

(الجواب) بالکل میری بھی رائے ہے آپ کی خوش فہمی سے خوش ہوا۔ باقی کانگریس کے جو حالات معلوم ہوئے ہیں ان کی بنا پر اس میں تو ہرگز شریک نہ ہونا چاہئے)

مسلم لیگ کی اہمیت

تحریک خلافت کے ختم ہونے کے بعد مسلمان تھوڑے عرصہ تک کانگریس میں شامل رہے۔ لیکن کانگریس کی مشرکانہ روش کی بنا پر ان کو بہت جلد پچھتانا پڑا[۱] پھر ان کو محسوس ہوا کہ خلافت کمیٹیوں کو کانگریس میں مدغم کر دینا مسلمانوں کی بہت بڑی سیاسی غلطی تھی۔ کانگریس کی [illegible] پالیسی نے مسلمانوں کو کانگریس چھوڑنے پر مجبور کر دیا ایک راستے پر چلتے چلتے جب مجبوراً قدم پیچھے اٹھانا پڑتا ہے تو ایسی صورت میں پریشانی اور انتشار لازمی ہے۔ لہٰذا مسلمان ایک عرصہ تک انتشار اور افتراق کا شکار رہے اور ایک سیاسی پلیٹ فارم پر جمع نہ ہو سکے۔ اسکی ایک وجہ اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ اصطلاحی طور سے لیگ نے تحریک "ترک موالات" کو اپنے نام سے منسوب کرنے کے بجائے خلافت کمیٹی کے نام سے منسوب کیا۔ خلافت کمیٹی کے تمام ممبران لیگ ہی کے ارکان تھے۔ اور مسلم لیگ ہی کی پالیسی کے ماتحت خلافت کمیٹی ۱۹۱۹ء میں "تحفظ خلافت اسلامیہ (عثمانیہ) کے لئے قائم کی گئی تھی۔ اسطرح دراصل خلافت کمیٹی لیگ ہی کی ایک شاخ تھی مگر اس سیاسی غلطی سے ایک طرف تو لیگ کے وقار کو کافی صدمہ پہونچا اور کانگریس نے عوام میں لیگ کو بے عملوں کی جماعت کہکر بدنام کیا اور دوسرے اسطرح مسلمانوں کی سیاسی تنظیم بھی دیرپا نہ رہ سکی۔ کیونکہ جب ترکی نے خلافت کو ترک کر دیا تو خلافت کی تحریک ہندوستان میں بھی کم ہوتی ہو گئی۔ اور مسلمانوں کی اس غیر معمولی تنظیم اور جوش سے زیادہ دیر تک فائدہ نہ اٹھایا جاسکا۔

بہر حال اسوقت سے ۱۹۳۶ء تک مسلمان سیاسی حیثیت سے بہت پیچھے رہے۔ لیکن اس ایک سال میں جو تنظیم اور بیداری مسلمانوں میں پیدا ہو گئی ہے وہ انتہائی خوشگوار دور کی آئینہ دار ہے جتنی ترقی کانگریس نے ۱۸۸۵ء سے ۱۹۱۹ء تک کی تھی بفضلہٖ مسلم لیگ نے

۱۔ بدقسمتی سے کانگریسی مسلمان پھر اسی تلخ دور کو دہرانا چاہتے ہیں۔

ایک سال میں کر لی۔ تمام قوم پرور عناصر کا لیگ میں آ شامل ہونا ملت اسلامیہ کیلئے فال نیک ہے۔ مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علیخان اور چودھری خلیق الزمان وغیرہ کا ایک سیاسی پلیٹ فارم پر آجانا نہ صرف مسلمانوں کیلئے ...... بلکہ ملک کے متحدہ مفاد کے لئے باعث فخر ہے کانگریس کے دل میں اگر ذرا بھی سیاسی اتحاد اور دوسری جماعتوں سے مفاہمت کا خیال ہوتا تو وہ لیگ کی موجودہ فضا کو تقویت دینے میں امداد و معاون ہوتی۔ اسلئے کہ لیگ میں جتنا قوم پرور عنصر داخل ہوگا لیگ اور کانگریس کا فاصلہ کم ہو گا۔ لیکن کانگریس اپنی طاقت کے نشہ میں اسقدر مدہوش ہے اور ہندو ذہنیت سے اسقدر مجبور ہے کہ وہ مسلمانوں کی تنظیم اور ان کے جماعتی استحکام کو نہ صرف ناپسند کرتی ہے بلکہ اس سے لرزہ براندام ہوتی ہے۔ وہ یہ کب گوارا کر سکتی تھی کہ جمعیتہ العلماء ہند اور لیگ ایک پلیٹ فارم پر آ کر مسلمانوں کی ایک مستحکم جماعت بنا سکیں۔ لہٰذا سب سے پہلے اس نے جناح اور حسین احمد صاحب میں اختلاف رائے پیدا کیا اور اسکے اشاروں پر ناچنے والے چند اصحاب نے مولانا کے سامنے بالکل غلط واقعات بیان کر کے لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے مستعفی ہونے پر مجبور کیا۔ لیگ کو بدنام کرنے کی ہر کوشش کی گئی۔ اس کو غلامی کا علمبردار اور رجعت پسند کی جماعت کے نام سے موسوم کیا گیا غضب یہ ہے کہ وہی حسرت موہانی جو کل تک بقول گاندھی جی کے ہندوستان میں سب سے زیادہ ایماندار سیاست دان اور حریت کے علمبردار تھے آج لیگ میں شامل ہوتے ہی رجعت پسند کہلانے لگے۔ وہی مولانا ظفر علیخان جن کی تعریف خود شیخ الہند مرحوم نے "یوم زمیندار" منانے کے سلسلہ میں کی تھی اب "[illegible] ملت" کے خطاب سے یاد کئے جانے لگے اور سر وزیر حسن صاحب جو کل تک لیگ میں شامل ہونے کی وجہ سے پورے سرکاری آدمی کہے جاتے تھے آج باوجود اپنے اونچے خطاب کے قومی ہیرو بن گئے۔ مگر اب عوام اس فریب سیاست سے آگاہ ہو چلے ہیں۔ یہ حقیقت ہے مسلم لیگ کے پاس نہ اتنا روپیہ ہے اور نہ پریس ہے جو عوام میں پروپیگنڈا کر سکے۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ مختصر طور سے ان خود غرض معترضین کو جو عوام کو بہکانے کیلئے اعتراض کیا کرتے ہیں کہ لیگ نے آجتک مسلمانوں کے لئے کوئی کام نہیں کیا۔ سمجھا سکوں کہ موجودہ سیاسی پوزیشن

جو مسلمانوں نے حاصل کرلی ہے وہ سو فیصدی لیگ ہی کی بدولت ہے۔ بے شک کمیونل ایوارڈ
لیگ کے مطالبات سے بہت کم ہے مگر جو کچھ بھی ہے وہ لیگ ہی کی بدولت ہے جس کو
ختم کرنے کیلئے ہر ایک کانگریسی تمام قوت صرف کر رہا ہے۔ آج جو مسلمانوں کو قانون ساز
اداروں میں اپنے نمائندے خود انتخاب کرنے کا حق ملا ہوا ہے یہ مسلم لیگ ہی کی متواتر
کوششوں کا نتیجہ ہے۔ آج یہ مسلمانوں کی ایک قلیل جماعت ایسی ہے جو جداگانہ طریق
انتخاب کی اہمیت سمجھنے سے قاصر ہے مگر جو اس متواتر جد و جہد سے واقف ہیں جو
مسلمانوں نے اس خاص حق کو منوانے میں کی ہیں وہ اس کی اہمیت سے خوب واقف ہیں
۱۹۰۹ء سے پیشتر تک مشترکہ انتخاب جاری رہا۔ ۱۸۶۱ء اور ۱۸۹۱ء کے ایکٹ کی رو سے
جو حقوق ہندوستانیوں کو ملے تھے انہیں مسلمانوں کا علیحدہ کوئی حصہ نہ تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا
کہ مسلمان ان حقوق سے ذرہ بھر فائدہ نہ اٹھا سکے اور ان کی نمائندگی حکومت کے کسی مقننہ میں
بھی نہ ہو سکی۔ ۱۸۹۶ء میں سب سے پہلے آنریبل سید محمود نے ایم اے او ڈیفنس ایسوسی ایشن
کے لئے ایک یادداشت تیار کی جس میں نہایت مدلل طریقہ سے انہوں نے ثابت کیا کہ جب تک
مسلمانوں کو خود اپنے نمائندے چننے کا اختیار نہ ہوگا اس وقت تک کونسلوں میں ان کی نمائندگی
نہیں ہو سکتی۔

اس قسم کی کوششیں برابر جاری رہیں اور مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم کی ضرورت برابر بڑھتی رہی
یہاں تک کہ چند سال کی کوششوں کے بعد ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی گئی
اس کے قیام سے مسلمان ایک سیاسی پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کیلئے
"جداگانہ انتخاب" کی جدوجہد کی۔ نواب عماد الملک صاحب مرحوم نے بالخصوص بہت
جانفشانی سے کوشش کی۔ ایک مضمون آپ نے ۱۹۰۹ء میں تحریر فرمایا۔ "اس پالیسی (مشترکہ انتخاب)
سے گورنمنٹ کو ایک فائدہ تو یہ ہو گیا ہے کہ ہندوؤں کا کثیر گروہ جو گورنمنٹ سے شکایت کرتا
کہ مسلمانوں کی مردم شماری سے زیادہ جو حصہ ان کو پولیٹیکل عظمت کے لحاظ سے دینا تجویز کیا گیا
تھا وہ ان کے نزدیک خلاف انصاف ہے اب اس شکایت کے جواب میں بجائے اس کے کہ
نہایت صبر اور صاف آواز سے کہدیا جاتا کہ گورنمنٹ کا یہ فیصلہ واقعات اور دا

[ہو]ئی ہے۔ اب ان شکایت کرنے والوں کو یہ کہہ کر مطمئن اور ساکت کر دیا جائے گا کہ
مسلمانوں کا وہ ذرا سا حصہ اب تمہاری ہی مجارٹی کے اختیار میں ہے ان کو دو یا نہ دو تم
جانو اور تمہارا کام۔" اھ

لیکن ہندوؤں کی ایک بڑی جماعت نے ان حقوق کی مخالفت کی خود گورنمنٹ کا بھی
منشا تھا۔ وزیر ہند لارڈ مارلے نے ۲۷ نومبر ۱۹۰۸ء کو جو ڈسپیچ حکومت ہند کے پاس
ارسال کیا اس میں مسلم نمائندگی کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے مخلوط انتخاب کی سفارش
کی تھی۔ مسلم لیگ کی کوشش برابر جاری رہی۔ لندن مسلم لیگ نے رائٹ آنریبل
امیر علی کی صدارت میں ایک وفد وزیر ہند کی خدمت میں بھیجا جس نے مخلوط انتخاب
کے خلاف کافی احتجاج کیا۔ ان کوششوں کا اثر یہ ہوا کہ یکم اپریل ۱۹۰۹ء کو نائب وزیر ہند
نے دار العوام میں کہا کہ "ایسے لوگوں نے جو ہماری طرف سے کچھ کہنے کا اختیار رکھتے ہیں مسلمانوں
سے پختہ وعدے کئے ہیں کہ انہیں اسی قدر اور اسی قسم کی نیابت دی جائے گی جو ان کی خواہش
کے مطابق ہوگی ہم اس وعدے سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے"...... مسٹر اسکوئیتھ وزیر اعظم نے
پارلیمان کی دوسری خواندگی کے موقع پر انتخاب جداگانہ کو تسلیم کر لیا۔ اس معاملہ میں مسلم لیگ
[نے] ہندوؤں سے بھی مفاہمت کرنے کی کوشش کی۔ بالخصوص مسٹر گوکھلے بہت معاون ثابت ہوئے
[لیگ] نے کانگریس سے سمجھوتہ کرنے کی بہت کوشش کی دسمبر ۱۹۱۵ء میں بمبئی میں لیگ و کانگریس
[کے] اجلاس ہوئے۔ اور نومبر ۱۹۱۶ء میں کلکتہ میں لیگ و کانگریس کی مشترکہ میٹنگ سر سریندر ناتھ
[بنر]جی کی صدارت میں ہوئی اور بڑی سعی کے بعد ایک میثاق مرتب ہوا جو لکھنؤ پیکٹ
[کے] نام سے موسوم ہوا۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں کانگریس کا اجلاس زیر صدارت سر
[مجم]دار اور مسلم لیگ کا زیر صدارت مسٹر محمد علی جناح منعقد ہوا۔ ۲۹ دسمبر کو کانگریس
اور ۳۱ دسمبر کو لیگ نے اس معاہدہ کی تصدیق کی
[اس] ایڈریس میں جناح کے مندرجہ ذیل الفاظ یادگار ہیں:۔

۱۔ انتخاب جداگانہ کا تاریخی خلاصہ از محمد امین زبیری

"میں اپنی پبلک زندگی میں ہمیشہ پکا کانگریسی رہا ہوں اور فرقہ وارانہ شور و غل کو میں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کا جو الزام مسلمانوں کے سر تھوپا جاتا ہے وہ نہایت نامناسب اور غیر متعلق ہے۔ جبکہ میں دیکھتا ہوں کہ عظیم الشان قومی نظام سرعت کے ساتھ متحدہ ہندوستان کی پیدائش کا ایک طاقت ور آلہ بنتا جاتا ہے ایک قلیل التعداد جماعت کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ اس کو اپنی حفاظت کا کامل اطمینان ہو۔ قبل اسکے کہ قومی کاموں میں اسکے وسیع تر سیاسی احساس کو باہمی امداد اور متحدہ کوشش پر آمادہ کیا جاوے مسلمانان ہند کو یہ طمانیت بحیثیت ایک جماعت کے اپنی سیاسی ہستی کے کامل اور موثر تحفظ ہی سے حاصل ہو سکتی ہے میری ذاتی رائے جو کچھ بھی ہو مگر یہاں میرا یہ فرض ہے کہ مسلمانوں کی کثیر التعداد جماعت کی رائے کی ترجمانی کروں جس کا آل انڈیا مسلم لیگ سیاسی آلہ ہے۔"

اس معاہدہ میں گورنمنٹ کو بہت افسوس ہوا گورنمنٹ مسلمانوں کے اس حق کو قایم رکھنے پر راضی نہ تھی اور اس کی منظوری گورنر جنرل اور وزیر ہند نے بہت بادل ناخواستہ دی۔ مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ ۱۹۱۸ء میں انتخاب جداگانہ کو قایم رکھتے ہوئے یہ الفاظ حکومت کی دلی منشا ظاہر کر رہے ہیں "اس کے ساتھ حقایق کو ملحوظ رکھنا چاہیے مسلمانوں کو ۱۹۰۹ء میں مخصوص نیابت اور جداگانہ انتخاب دیا جا چکا تھا۔ دونوں فرقوں کے درمیان جو سمجھوتہ ہوا ہے اس میں ہندوؤں کی رضامندی شامل ہے اسی لئے مسلمان ان دونوں چیزوں کو امور فیصل شدہ قرار دیتے ہیں اور ان کو بدلنے کی کوشش بھی کی گئی تو انکے ساتھ نہایت سختی سے احتجاج کیا جائیگا" بالآخر یہ مطالبہ مسلم لیگ کی کوششوں سے پھر منظور ہو گیا۔ چند نفوس آجکل جو جداگانہ انتخاب کے خلاف ہیں وہ نہیں غور کرتے ہیں کہ کن کن مصیبتوں سے مسلم لیگ نے اس حق کو منوایا ہے۔ حکومت اور کانگریس دونوں نے اس کی ہمیشہ مخالفت کی ہے۔ لیکن محمد علی جناح علی برادران ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں وغیرہ کی کوششوں سے یہ مطالبہ دونوں کو تسلیم کرنا پڑا۔

ڈاکٹر انصاری مرحوم نے ۱۹۱۸ء میں بحیثیت صدر جماعت استقبالیہ مسلم لیگ منعقدہ دہلی یہ الفاظ جداگانہ انتخاب کی حمایت کرتے ہوئے حکومت پر نکتہ چینی کی تھی۔

"گورنمنٹ کے نام نہاد زاویہ نگاہ میں جو تبدیلی واقع ہوئی اسکی مزید شہادت اس امر سے حاصل ہوتی ہے کہ مسٹر مانٹیگو اور چیمسفورڈ نے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ان کے اس خاص حق کی مخالفت کی ہے جو زمانہ موجودہ میں ہماری سیاسی تحریکات کا روح رواں ہے۔ ان تحقیقی وعدوں پر جو گورنمنٹ کر چکی ہے اور اس سمجھوتہ پر جو ہمارے اور اہل ہنود کے درمیان ہو چکا ہے اور خود اپنے قومی مفاد پر نظر کرتے ہوئے ہم حکومت کو اپنے وعدوں سے روگرداں ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ علاوہ بریں مسلمانان ہند کے نمایندے امپیریل کانفرنس اور مجلس جنگ کے مباحث میں نہ شریک کیا جانا مسلمانوں کے اس احساس میں اضافہ کرتا ہے کہ ان کے ساتھ لاپروائی برتی جا رہی ہے"

اسکے بعد ۱۹۲۴ء میں اصلاحات کے سلسلہ میں جب حکومت نے سر الیگزینڈر موڈی کی صدارت میں ایک کمیٹی بٹھائی جس کے ارکان میں سے میاں سر محمد شفیع مرحوم اور محمد علی جناح بھی تھے تو انھیں دونوں حضرات کی کوششوں سے اس کمیٹی نے بھی جداگانہ انتخاب کی سفارش کی اسکے بعد سائمن کمیشن کے سامنے جتنی رپورٹیں پیش ہوئیں سب میں مسلمانوں کے اس مطالبہ کی حمایت کی گئی۔

لیکن اسکے بعد سے کانگریس کی ذہنیت میں تبدیلی شروع ہوئی جس کا مفصل ذکر پہلے آ چکا ہے جس کی بنا پر اسنے اس حق کو تسلیم کرنے سے بالکل انکار کر دیا مسلم لیگ نے برابر مفاہمت کی کوشش کی۔ اور متعدد بار اس قسم کی تجاویز پیش کیں۔ اس زمانے کے تمام خطبات صدارت مسلم لیگ اس قسم کی مفاہمت کی کوششوں کے بیانات سے پر ہیں۔ بالخصوص سر عبد القادر نے ۱۹۲۶ء میں جو خطبہ صدارت دیا اسمیں تمامتر توجہ ہندو مسلم اتحاد ہی پر صرف کی ہے جسمیں انھوں نے تجویز کیا تھا کہ مسلمان ہندو پھر ایک جگہ پر جمع ہو کر یا تو ۱۹۱۶ء کے میثاق میں ترمیم کریں یا ایک

نیا معاہدہ کر لیں تاکہ موجودہ کشمکش دور ہو جائے۔ مگر اس وقت کانگریس اپنے ایک پونڈ گوشت کے ٹکڑے پر برابر مصر رہی حکومت کو ان اختلافات سے خوش ہونا چاہیے تھا اسلئے کہ وہ دیکھ رہی تھی کہ ملک کی سب سے بڑی جماعت جو آزادی کا دعویٰ کرتی ہے وہی فرقہ وارانہ گتھی کو اور پیچیدہ بنائے چلی جا رہی تھی۔

۲ جولائی ۱۹۲۹ء کو لارڈ برکن ہیڈ کی تقریر جو دار الامراء میں ہوئی اس سے صاف ظاہر ہے کہ کس طرح حکومت برطانیہ دور کھڑی ہو کر اس لڑائی کا تماشہ دیکھ رہی تھی اس میں آپ نے فرمایا تھا کہ:۔

”سب سے بڑی تشویش جس سے آج ہندوستان کو سابقہ ہے وہ فرقہ وارانہ اختلاف ہے جو سات کروڑ مسلمانوں کو کثیر ہندو آبادی سے جدا کرتا ہے۔ ان اختلافات میں ہم اپنے ہاتھوں کو آلودہ کرنا نہیں چاہتے۔ اگر کل ہم ہندوستان سے چلے جائیں تو اس کا فوری نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندو و مسلمانوں میں جنگ شروع ہو جاوے گی۔“

محمد علی جناح صاحب اس وقت تک محمد علی مرحوم سے بھی زیادہ کانگریس کے حامی تھے یہاں تک کہ آپ نے شفیع سکشن کو لیگ سے بالکل باہر کر دیا تھا انھوں نے اور محمد علی مرحوم نے اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں کہ کسیطرح کوئی مصالحت کانگریس سے ہو جائے مگر دونوں ناکام رہے۔

مسٹر جناح نے جو بیان ۸ جنوری ۱۹۲۹ء کو پریس میں دیا اس میں کانگریس کی اس تباہ کن ذہنیت پر انھوں نے کافی ماتم کیا تھا

آپ نے فرمایا تھا کہ جسطرح مسلم لیگ نے شفیع سکشن کو علیحدہ کر دیا اور اپنی بہادری اور ہمت کا ثبوت دیا اسیطرح کانگریس کو بھی چاہیے تھا کہ وہ بھی جیکار اور مونجے کو نکال باہر کرتی“

مولانا محمد علی مرحوم نے تمام کوششوں سے مایوس ہو کر جو بیان اس زمانے میں اپنے اخبار ”ہمدرد“ میں شایع کیا تھا وہ کسقدر عبرت خیز ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب محمد علی کو بھی کانگریسی مسلمان رجعت پسند فرقہ پرور کہتے تھے جو آج حضرت اور شوکت علی صاحب کو

کہہ رہے ہیں وہ بیان یہ تھا:۔

”دنیا غیر سے زیادہ خود اپنے وطن میں غریب الوطن ہوں۔ انھیں زبانوں سے جن سے آج اپنی ہجو سن رہا ہوں اپنی تعریف میں ہزاروں قصیدے بھی سن چکا ہوں۔ ہمارے قید ہوتے ہی ہندو مہا سبھا کی مہاراشٹر نے عدم تعاون کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ خود مہاتما گاندھی نے حکومت کو الٹی میٹم دیکر چھکنے کے بعد بارڈولی میں وہ روش اختیار کی جسے ملک نے ہتھیار ڈالدینے کے مترادف سمجھا۔ اور وہ خود بھی ہماری طرح قید کر دیئے گئے۔ ان کے قید ہونے کے بعد پنڈت موتی لال نہرو اور دیش بندھو داس آزاد ہوئے۔ اور بجائے سول نافرمانی شروع کرنے کے جس کا یاد ش بخیر! اب کلکتہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ گیا میں سوراج پارٹی کے نام سے وہ علم بغاوت بلند کیا جس نے عدم تعاون کی تحریک کا خاتمہ کر دیا۔ پھر لطف یہ کہ ہندو مہا سبھائیوں نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کیں۔ جنھوں نے مذہبی تعصبات کی آگ کو پھر بھڑکا دیا جسکو ہم نے ٹھنڈا کیا تھا۔ . . . . آج یہی حضرات کلکتہ کی تماشا گاہ میں اپنا سوانگ بھر رہے ہیں۔ پنڈت موتی لال اور انکے ساتھیوں کو کونسلوں اور اسمبلی کی شرکت سے جو کچھ سوراج ملا یا وہ ہمارے سامنے ہے۔ اس شرکت میں پنڈت جی کو جو آج کانگریس کے صدر ہیں اتنا اصرار تھا کہ انھوں نے خود مجھ سے فرمایا تھا کہ اگر کانگریس نے شرکت کی اجازت نہ دی تو میں کانگریس کے گرد اگرد دو سو میل کے احاطہ میں بھی قدم نہ رکھونگا میں نے اس خیال سے طرح دی کہ آج کے خداوند کانگریس و کونسلوں کو اجازت دلوائی کہ کہیں پرسوں جیل سے نکل کر مہاتما گاندھی مجھ سے شکایت نہ کریں کہ تم نے کانگریس سے اتنی بڑی اقلیت کیوں نکلوا دیا۔ ورنہ دہلی اور کوکناڈا میں موتی لال جی کو شکست فاش نصیب ہوتی“

۱؎ خدا کرے کہ وہ کانگریسی مسلمان اس بیان کو بغور پڑھیں جو اس تاریخ کا اعادہ کر رہے ہیں اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کو تحریک عدم تعاون کے ختم ہو جانے کا کس قدر صدمہ ہوا تھا۔

اس زمانہ کے حالات نے مسلمانوں کو اور بھی مجبور کر دیا کہ وہ "جداگانہ انتخاب" کے مطالبہ کو ہرگز ترک نہ کریں۔ گول میز کانفرنس کا آغاز ہونے والا تھا۔ مسلم لیگ نے اپنے اس مطالبہ کو بہت زور سے پیش کیا یہاں تک کہ سنہ ۱۹۳۱ء میں لارڈ ارون کو وزیر ہند کے پاس ایک مراسلہ بھیجنا پڑا جس میں یہ واضح کر دیا گیا کہ "وہ رعایت جداگانہ انتخاب جو مسلمانوں کو حاصل ہے وہ ان کی مرضی کے خلاف نہ واپس لی جا سکتی ہے نہ لینی چاہئے"۔

گاندھی ارون پیکٹ ہو جانے کے بعد اور گاندھی جی کے لندن جانے سے قبل مسلم لیگ کے زعماء نے کافی کوشش کی کہ کسیطرح فرقہ وارانہ گتھی ہندوستان ہی میں حل ہو جاوے۔ مگر گاندھی جی نے مسلم مطالبات کو جس میں انتخاب جداگانہ سب سے اہم تھا۔ (صرف ایسی صورت میں منظور کرنے کا وعدہ کیا کہ کانگریسی مسلمان بھی اس کو منظور کر لیں۔ ان حضرات میں سے بعض کانگریس کے اشاروں پر مخلوط انتخاب پر جمے ہوئے تھے اسلئے کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

گول میز کانفرنس میں باوجود گاندھی جی کی موجودگی کے کانگریسی لیڈروں نے جو فرقہ وارانہ ذہنیت کا ثبوت دیا ہے اور مسلم لیگ کے ارکان نے جس مزاج حوصلگی سے کام لیا وہ سیاسی طبقہ سے پوشیدہ نہیں ہے خود گاندھی جی کا طرز عمل اسقدر عجیب رہا کہ انکے ... بلنگ جیکون کے تمام دعوے بیکار ثابت ہوئے ہفتوں تک محمد علی جناح اور دوسرے مسلمان لیڈروں نے کوشش کی کہ بجائے اس کے کہ وزیر اعظم اس فیصلہ کو ... کریں ہم خود کرلیں۔ یہ ہماری خودداری کے خلاف ہوگا"۔ لیکن تمام کمیٹیاں بیکار ... ہوئیں۔ مسلمان لیڈران کی رائے سے تمام اقلیتوں کی ایک کمیٹی (مینارٹی کمیٹی) مقرر کی گئی۔ جسمیں تمام اقلیتوں نے ملکر کانگریس سے مفاہمت کرنا چاہی مگر کانگ...

---

۱ کانگریس کی ہر قسم کی سیاسی چالیں ہمیشہ ہوتی ہیں کہ ایسے معاملات میں خود مسلمانوں کی زبانی اختلاف پیدا کرتی ہے۔ آجکل مولانا آزاد کو مسلم وزارتوں کا انچارج اسی لئے بنایا گیا کہ مسلم... کے مطالبہ کا جواب ایک مسلمان لیڈر ہی دے اور کانگریس الزام سے بری رہے۔

ایک قدم نہ ہٹی اور ریشہ دیسے بیچارہ رہ گیا۔ خود گاندھی جی نے مینارٹی کمیٹی کے آخر میں تسلیم کیا کہ "میں اپنی ذات سے تو مسلمانوں کو سب کچھ دینے کو تیار ہوں جو وہ چاہتے ہیں اور میں رات کو پچھلے پہر تک ہندوؤں اور سکھوں کو آمادہ کرتا رہا کہ میرا ساتھ دیں۔ مگر مجھے ناکامی ہوئی"۔

مگر یہ بھی گاندھی جی کی محض سخن طرازی تھی جب مسلمانوں نے ان کو یقین دلایا کہ وہ ہر صورت میں کانگریس کے ساتھ ہیں۔ بشرطیکہ ان کی شرائط کو تسلیم کر لیا جائے تو گاندھی جی نے صاف انکار کر دیا اور صرف اس شرط پر صلح کرنی چاہی کہ مسلمان دوسری اقلیتوں کی "جداگانہ اقلیت" کے معاملہ میں مدد نہ کریں بجز سکھوں کے۔ اور ایسے ہندوؤں کے جو اپنے صوبوں میں اقلیت رکھتے ہیں۔ مگر مسلمان اس خود غرضانہ پالیسی پر عمل کرنے کو تیار نہ تھے۔ آخر کار تمام اقلیتوں نے گاندھی جی کے طرز عمل سے مجبور ہو کر آپس میں معاہدہ کر لیا جسپر دوسری اقلیتوں نے مسلم لیگ کا بیحد شکریہ ادا کیا۔ اور اسطرح مسلم لیگ نے وہاں بھی اپنی فراخ حوصلگی کا ثبوت دیا۔ گاندھی جی نے اس معاہدہ کو توڑنے کی بھی کافی کوشش کی اور ۱۴ نومبر کو مسلم ڈیلیگیشن سے ملاقات کر کے ان کو پھر آمادہ کرنا چاہا۔ مگر مسلمانوں نے انکار کر دیا۔ مہاتما گاندھی نے الگ ایک جلسہ طلب کیا مگر سب بیکار رہا۔ اس جلسہ میں سر ... بھی شریک تھے۔ ۱۹۳۵ء میں آپ نے اپنے ایک بیان میں اس جلسہ کا ان الفاظ میں خوب نقشہ کھینچا ہے۔

"گاندھی جی نے ۲۰ یا ۲۸ اشخاص کا ایک جلسہ طلب کیا جو قیصر سینٹ جیمس میں ہر رات جمع ہوتے تھے۔ اگر میں بعض ان حضرات کے طرز عمل کا تذکرہ کروں جنہوں نے اس جلسہ کی تمام کارروائیوں میں حصہ لیا تھا تو یہ گویا مسئلہ کے بہت ہی نازک پہلو کا اظہار ہوگا ان کارروائیوں کی سچی اور مکمل تاریخ تو لکھی جانی ابھی باقی ہے۔ لیکن میں بلا خوف تردید یہ بیان کروں گا کہ اس آخری رات کو جب جلسہ ہوا تو ذہنی اضطراب کے آثار ان کے گاندھی جی کے چہرہ سے عیاں تھے۔ ہم بغیر کچھ حاصل کئے ہوئے اٹھے اور اس وقت ایران کے شاعر اعظم فردوسی کا قول مجھے یاد آ گیا جو اس نے تاریخ ایران کے ایک مشہور واقعہ کے متعلق

کہا تھا۔ "نشستند و گفتند و برخاستند"

میں نے اس تاثر کو اپنی ڈائری میں اسی وقت قلمبند کیا...... اس کا اندراج اس طرح ہو
نام نہاد ہندوستانی قومیت کا جنازہ نکلتے دیکھا جسکے مخصوص کندھا دینے
والوں میں .... تھے۔ کیا وہ پھر زندہ بھی ہو گی"

سہروردی کا یہ نوٹ کانگریس کی پوری تصویر کا آئینہ دار ہے۔ انگلستان تک کے ہر لیڈر
نے کانگریس کی اس ذہنیت کا ماتم کیا۔ آخر کار وزیر اعظم نے خود ہندو ڈیلیگیشن کی
درخواست پر فرقہ وارانہ مسئلہ کو اپنے فیصلہ سے حل کیا۔[1] اس میں بھی مسلمانوں کے
سب سے بڑے مطالبہ "جداگانہ انتخاب" کو تسلیم کیا گیا ہے جو اب تک قائم ہے۔ اگرچہ اب
کانگریس وزارت مختلف صوبوں میں لوکل جماعتوں میں مخلوط انتخاب جاری کرنے کی فکر
میں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "جداگانہ انتخاب" کا حاصل کر لینا مسلم لیگ کا مسلمانوں کے لئے بہت بڑا
کارنامہ ہے اس سلسلہ میں ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ پیکٹ مرتب کرنے میں اور اسکے بعد برابر
مسلم لیگ نے کانگریس سے مفاہمت کرنے میں ہر کوشش کی۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے
تو جو روپیہ مسلمانوں نے اس واحد ادارے کے قیام و استحکام میں صرف کیا ہے وہ اس حق
انتخاب حاصل کرنے اور ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں کرنے میں مسلم لیگ نے سب وصول کر دیا
صرف یہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی جو کچھ سیاسی پوزیشن اس وقت ملک میں ہے وہ مسلم
لیگ کی ہی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ محمد علی جناح کے "چودہ نکات" دنیا بھر میں مشہور
ہیں۔ ان میں سے بیشتر حصہ ان کی کوششوں سے حاصل ہو چکا ہے۔ اور کچھ باقی ہے۔
آج جو صوبائی حکومتوں کا نظام نافذ ہے وہ انہیں چودہ مطالبات کی منظور کردہ شکل

---

[1] اس درخواست پر مہاراجہ دربھنگہ۔ سر تیج سپرو، سروجنی نائیڈو، ماسٹر نریندر ناتھ، سیٹھ
مسٹر اینگر اور دوسرے چھ ہندوؤں نے دستخط کئے تھے گاندھی جی نے خود ایک خط وزیر اعظم کو
اس مضمون کا لکھا تھا۔

ہے۔ کانگریس صوبوں کی آزادی کے خلاف تھی۔ نہرو رپورٹ میں کانگریس نے اس وفاقی شکل
کی مخالفت کرتے ہوئے "لامرکزی حکومت" (وحدانی طرز حکومت) نصب العین قرار دیا
تھا تاکہ اس طرح جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ صوبے بھی مرکزی حکومت
کے ماتحت رہیں۔ اور تمام ملک میں ہندو اکثریت کا راج قائم ہو جائے۔ مگر محمد علی جناح
اور دوسرے مسلم لیگ کے زعمانے صوبائی حکومت پر زور دیا تاکہ کم از کم جن صوبوں میں
مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں وہ ہندو اکثریت سے آزاد رہیں۔

ان کے مطالبات میں سے "سرحد اور بلوچستان کے لئے اور صوبوں کی طرح اصلاح و
حقوق" کا مطالبہ بھی تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ سرحد میں لیگ کی کوششوں سے وہی حقوق
مل گئے ہیں جو اور صوبوں میں ہیں۔ مگر بلوچستان کو ابھی نہیں ملے جس کے لئے برابر جد و جہد
جاری ہے۔ گذشتہ اجلاس لکھنؤ ہی میں بلوچستان کے متعلق حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے
لیگ کا تیسرا مطالبہ مسلمانوں کی بنگال اور پنجاب میں اکثریت قائم رکھنے کا تھا۔ پنجاب
میں ۵۱ فیصدی نیابت تسلیم کی گئی مگر بنگال میں بجائے ۵۵ فیصدی کے ۴۹ فیصدی
دی گئی جسکے خلاف لیگ نے ہمیشہ احتجاج کیا۔

مرکزی مجالس میں حکومت برطانیہ نے ایک تہائی مسلم نیابت لیگ کے چوتھے
مطالبہ کو منظور کرتے ہوئے تسلیم کر لی اور وزیر ہند نے خود تیسری گول میز کانفرنس میں
اس کا اعلان کیا۔

پانچواں مطالبہ "جداگانہ انتخاب" کا برابر منظور ہوتا رہا۔

ملازمتوں میں مسلم لیگ کی کوششوں سے مسلمانوں کے لئے صرف مرکزی ملازمتوں
میں پچیس فی صدی کا تعین کیا گیا۔ علاوہ مرکزی ملازمتوں کے دوسرے
دفاتر میں برابر ان کی حق تلفی ہو رہی ہے۔

بیشک ایک عرصہ تک مسلمانوں کی باہمی کشمکش اور سیاسی انتشار و افتراق کی وجہ سے
مسلم لیگ غیر منظم رہی۔ اور اغیار کو اسکے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کا موقع مل گیا۔ لیکن
اس انتشار کے باوجود لیگ اور اکابر لیگ نے جو خدمات مسلمانوں کی کی ہیں وہ فراموش نہیں کی جا سکتی

ہیں۔ اس ایک سال کے اندر جو ترقی لیگ نے کی ہے اور جتنی سیاسی بیداری اس نے مسلمانوں میں پیدا کر دی ہے وہ یقیناً قابل مبارکباد ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کانگریس اس تنظیم سے اس قدر پریشان ہے کہ جتنی مخالفت اس نے لیگ کی اب کی ہے وہ اس کی گذشتہ تیس سالہ زندگی میں کبھی نہیں کی۔ حالانکہ موجودہ لیگ کانگریس کے بالکل ہمنوا اور ہم مقصد ہے۔ گذشتہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں جو پروگرام لیگ نے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہے اس نے اس کو کانگریس سے بھی آگے کھڑا کر دیا ہے۔ کانگریس کے پروگرام میں مہاجنی سود کے خلاف کبھی آج تک کوئی لفظ شامل نہیں کیا گیا اسلئے کہ اس میں ہندو مہاجنوں کا نقصان ہے۔ برخلاف اسکے لیگ کے پروگرام کا سب سے اہم جزو مہاجنی سود کو بند کرنا ہے۔ آئین کے لحاظ سے لیگ کانگریس سے پیچھے نہیں رہی۔ ہر مسلمان دو آنہ ادا کر کے لیگ کا ممبر بن سکتا ہے۔ تمام مجالس عاملہ انتخاب کے ذریعہ بنیں گی۔ اب کسی فریق کو کوئی موقعہ شکایت کا باقی نہیں رہا۔ بڑی سے بڑی انقلابی جماعت اپنے ہم خیال عناصر کو جمع کر کے اس پر قبضہ کر سکتی ہے۔

اپنے نصب العین میں لیگ کانگریس سے کہیں آگے نکل گئی ہے لیگ کے نصب العین اور اسکی موجودہ بیداری پر مسٹر ایم۔ این۔ رائے نے اپنے خیالات کا اظہار نہایت منصفانہ طور سے کیا ہے۔ اگر ملک کے تمام کانگریسی لیڈر اسطرح انصاف کو مدنظر رکھ کر حالات پر غور کریں تو موجودہ فضا اتنی مکدر نہ رہے۔ مسٹر ایم۔ این۔ رائے کانگریس میں بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں انکا مطالعہ سیاست بیحد وسیع اور ان کی ذہنیت جواہر لال جی سے زیادہ انقلابی اور اشتراکیت پسند ہے وہ ایک طویل مضمون کے دوران میں فرماتے ہیں۔

وہ کہنا تو یہ چاہیے کہ مسلم لیگ یکایک چونک پڑی ہے اور یہ بیداری نتیجہ خیز اور دور رس ہے۔ وہ حضرات جو مسلمان قوم پرست کی حب الوطنی کو کانگریس سے باہر مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ ممکن ہے یہی سمجھیں کہ یہی وقتی جوش کا مظاہرہ ہے۔ لیکن ایسا سمجھنا ان کی غلطی ہے۔ ملک کی

موجودہ فضا پر ہر طرف سے بے اطمینانی چھائی ہوئی ہے اور اب یہ جذبہ بغاوت کی حد تک ہو چکا ہے۔ اور عوام خواہ مسلمان ہوں یا ہندو دونوں اس سے متاثر ہیں۔ دوسری کامیاب پارٹیوں کے غیر مسلم رہنماؤں کی کامیابی اب بھی رائے عامہ کے ساتھ مشروط ہے یا بالفاظ دیگر لیگ کی موجودہ بیداری تمام مسلمانوں کے جذبہ تنفر کی وجہ سے ہے جو آمریت یا شہنشاہیت کے خلاف پیدا ہو گیا ہے۔ ورنہ مولانا حسرت موہانی ملک کی آزادی کے ریزولیوشن کو جو اس لحاظ سے کہ آزاد ہندوستان کے دستور اساسی کے بنیادی اصول کو پیش کرتا ہے اور جو کانگریس کے ریزولیوشن سے زیادہ واضح ہے۔ اس کو پیش کر کے جناح جیسی ہستیوں کو اپنا ہم خیال نہیں بنا سکتے تھے۔

کانگریس کا کریڈ مبہم ہے

ریزولیوشن کی رو سے ہندوستان کے لئے ایسی مکمل آزادی طلب کی گئی ہے جس میں آزاد جمہوری ریاستوں کا فیڈریشن یا وفاق ہو جہاں مسلم اور دیگر اقلیتوں کے حقوق کیلئے کافی اور موثر طریقہ کے تحفظات ہوں۔ ریزولیوشن کے پہلے حصہ میں وہ بات آتی ہے جو فیض پور سیشن سے پہلے کانگریس میں بھی پیش نہیں ہوئی تھی۔ کانگریسی سوراجی نظریہ لاہور کے آزادی کے ریزولیوشن کے پاس ہونے کے بعد بھی کسی حد تک غیر واضح رہا ہے۔ یہاں تک کہ پورن سوراج کے مفہوم کو آزاد جمہوریت کے تعین میں سات سال کا زمانہ گذر گیا اور پھر بھی پورن سوراج کے یہ معنی کانگریس کے کریڈ سے خارج ہیں۔ جب واقعات یہ ہیں تو ہمیں جرأت اور صفائی سے اقرار کر لینا چاہیے کہ گو اسکے چند رہنماؤں کے خیالات اور نظریہ کچھ ہوں لیکن مسلم لیگ پر یہ الزام عائد نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ایک ایسی

جماعت ہے جو برطانوی شہنشاہیت کے دامن میں صرف پناہ لینا چاہتی
ہے یا آزاد ہندوستان کے دستور کی مخالفت اس کا شیوہ ہے۔"
اس رزولیوشن کو پیش کرتے ہوئے صاف صاف غیر مشتبہ الفاظ میں ظاہر کر دیا
ہے کہ وفاق کا ہر عضو ایک جمہوری ریاست ہونا چاہئے۔ نیز یہ کہ ہندوستانی ریاستوں کی
جبتک کہ انکی حکومت جمہوریت کی بنیادوں پر ہو گی قانون میں ان کی کوئی حیثیت تسلیم
نہ کی جائے گی یہ ایک جسارت انگیز اعلان ہے جس سے ابتک کانگریس قاصر رہا ہے دیسی
ریاستوں کے باشندے اس اعلان کیلئے بیتاب ہیں اور کانگریس اگر صحیح معنوں میں سمجھتی ہے
کہ وفاقی اسکیم ناکامیاب ہے تو یہ وقت ہے کہ وہ ان کا اعلان کرے۔ مولانا حسرت کا یہ
ذاتی رائے قرار دیکر اسلئے کہ وہ عرصہ دراز سے کانگریس میں ہیں مسلم لیگ کی جرأت کی اہمیت کو کم
نہیں کیا جا سکتا ہم ان کی اس ہمت مردانہ کی داد دیتے ہیں لیکن یہ بھی خیال ہے کہ لیگ کے
ایوانوں نے انکی ہمنوائی کی ہے۔ اور اس کھلی ہوئی جنگ کی آواز کا جو ہندوستانی ریاستوں
کے خلاف اٹھائی گئی ہے۔ کسی نے مخالفت کی جرأت بھی نہیں کی مولانا حسرت پرانے کانگریسی
ہیں اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ آپ ہی کی شخصیت ہے جس نے احمد آباد سیشن میں سب سے پہلے
آزادی کامل کا ریزولیوشن پیش کیا تھا۔ اسلئے ہم ان کی حب الوطنی پر شبہ نہیں کر سکتے البتہ ہمارا
فرض ہے کہ ان کی بتائی ہوئی راہ پر چلیں۔

حریت پسند مسلمانوں کی جرأت کی داد دینی چاہیے

"ایک حیثیت سے اور بھی (اور یہ سب سے زیادہ بنیادی نقطہ ہے) مسلم لیگ کا ریزولیوشن
کانگریس کے پورن سوراج کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ مولانا ظفر علی خان نے (جو خود بھی
ریڈیکل کانگریسی ہیں) رزولیوشن پر بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ رزولیوشن قانون کے تحت
"امن پرورانہ طریقہ کے الفاظ کا شرمندہ احسان نہیں تاریخ شاہد ہے کہ آزادی بغیر قوت
کے کبھی حاصل نہیں کی گئی۔ ہم اپنی گذشتہ اشاعت میں رہنماؤں کی اکثریت کی کانگریس
نے اصول آزادی سے رفتہ رفتہ انحراف اور … کی تاریخ کو بیان کر چکے ہیں

اور یہ یقینی امر ہے کہ اکثر کانگریسی حضرات کانگریس کے سیاسی کریڈ کے نقائص سے
واقف ہونے پر بھی جرأت عمل کے مفقود ہونے کی وجہ سے انکے دور کرنے کی کوشش نہیں
کرتے برعکس انکے مسلم قوم پرست کی آزادیٔ ضمیر کی داد دینی چاہئے کہ وہ بلا کم و کاست
اسکے اظہار میں بیباک ہیں پھر کیا مسلمانوں کی قوم پرستی کو ہم صرف اسلئے مشتبہ نگاہوں سے
دیکھیں کہ وہ تلوار کے دھنی ہیں ہمیں شک نہیں کہ مسلم لیگ میں کچھ ایسے لیڈر بھی ہیں جو جنگ کی
اس بیداری کے مخالف اور رزولیوشن کے موافقت کرنے والوں کے ہمنوا بھی نہیں
ہیں تاہم اس رزولیوشن کا متحدہ جوش و خروش سے پاس ہو جانا ہی ایک اہم امر ہے جس سے
ہوا کے رخ کا پتہ چلتا ہے۔"

مسٹر ایم این رائے کے اس بیان سے کانگریسی حلقوں میں آگ سی لگ گئی
اور متعدد خطوط ان کے پاس کانگریسی اصحاب کے احتجاجاً آئے جس میں ایک خط مسٹر رائے
نے مع اپنے جواب کے ۱۴ نومبر ۱۹۳۷ء کے انڈیپنڈنٹ میں شایع کیا ہے وہ خط مسٹر
بی۔ جی۔ دیش پانڈے کا لکھا ہوا ہے جو برار کے رہنے والے ہیں۔ اس کا مندرجہ ذیل
جواب مسٹر رائے نے دیا ہے وہ بھی متعدد کانگریسیوں کی عبرت کے لئے کافی ہے۔

"اس مراسلے سے اس افسوسناک حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ نوجوان ممبران کانگریس
بھی جو کہ انقلابی ذہنیت کے دعویدار ہیں مسلمانوں کے خلاف متعصبانہ جذبات رکھتے ہیں مضمون
نگار نے اس بات کی تائید میں کہ مسلم لیگ کے رہنماؤں پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے کوئی دلیل
بھی پیش نہیں کی ہے۔ جو اعتراضات مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خان پر
کئے گئے ہیں وہ سب بے حقیقت ہیں۔ ہمارے نامہ نگار کو اس بات کا اعتراف ہے کہ مسلم لیگ
کے ان رہنماؤں کی ترغیب سے جو رزولیوشن مکمل آزادی کے متعلق پاس کیا ہے وہ کانگریس
کے عقیدہ آزادی سے بدرجہا آگے بڑھا ہوا ہے۔ ہم نے بھی اس بات پر اپنے مضمون
میں زور دیا تھا۔ اگر کسی شخص کی موجودہ زندگی قابل ملامت ہے تو اس شخص کی گذشتہ
خدمات کی بنا پر ہم کوئی تعریف کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ لیکن ہم اسکے بھی مخالف ہیں کہ
کسی شخص کے خلوص کو صرف اس لئے ٹھکرایا جائے کہ وہ مسلم لیگ سے تعلق رکھتا ہے۔ آیا

مسلم لیگ کے رزولیوشن صرف نمائشی ہیں یا حقیقی۔ اس کا فیصلہ زمانہ خود کریگا اسوقت ان رزولیوشن کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے کے یہ معنی ہیں کہ مسلم لیگ کے رہنماؤں کی توہین کیجائے۔ دوسروں کو اپنی جانب مخاطب کرنے کا یہ بدترین طریقہ ہے ہمارے مضمون کا مفہوم یہ ہے کہ مسلم لیگ نے آزادی کامل کا رزولیوشن پاس کرکے انقلاب کی جانب قدم اٹھایا ہے اس بات کا فیصلہ نہیں کیا گیا ہے جبکہ کانگریس موجودہ نظام حکومت کو چلا رہی ہے تو پھر کمیونل اوارڈ (فرقہ وارانہ فیصلہ) کو ایک "منفصل شدہ معاملہ کے طور پر" تسلیم کرنے میں اسے کیا عذر ہے؟ پھر کانگریس اقلیت کیلیے ایک مخصوص قسم کے انتخاب کی حمایت میں آواز کیوں نہ اٹھاتی ہے؟ جبتک ہم اس اہم مسئلہ کے متعلق اپنے رویہ کو واضح نہیں کر لیتے تب تک مسلمان فرقہ پرستوں کو غیر مسلح کرنا نا ممکن ہے۔ یہ بات آسان ہے کہ ذمہ داری کے بار کو جس کا تعلق مساوی طور پر ہم سے بھی ہے دوسروں پر ڈالا جائے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ مسلم لیگ والے رجعت پسند ہیں۔ انقلابی قوم پرستوں کو یہ جاننا چاہیے کہ یہ الزام تنہا مسلم لیگ والوں ہی پر عائد نہیں ہوتا ہے جو لوگ شیشے کے محلوں میں رہتے ہیں۔ انھیں دوسروں کے مکانوں پر پتھر نہیں پھینکنے چاہیئں۔ ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ مسلم لیگ نے اپنا عقیدہ صرف جمہور کو دھوکہ دینے کے لیے تبدیل کیا ہے جبکہ کانگریس نے جمہور رزولیوشن دربارہ آزادی کامل کو بالائے طاق رکھدیا ہے اگر واقعی ہم اتحاد کے طالب ہیں تو زبردستی شرائط منوانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے اتحاد کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم اقلیتوں کے انتخاب جداگانہ کے اصول کو تسلیم کرلیں مسلمانوں سے اتحاد کی خاطر اگر ہمارے انقلاب پسند نوجوان اپنے رہنماؤں کو ہندو رجعت پسندوں کے اثرات سے علیحدہ کر سکیں تو تمام فرقہ پرست جماعتیں خود بخود ختم ہو جائینگی صرف گالیاں اور پھبتیاں اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی ہیں۔

مسلم لیگ اور جمعیۃ العلماء ہند

لیگ کے اس سیاسی ارتقا اور مکمل ذہنی انقلاب کے بعد جس پر شرح رائے نہایت منصفانہ نظر ڈالی ہے کانگریس کا برابر لیگ کی مخالفت پر جمے رہنا اور کوئی معنی ہی نہیں رکھتا سوائے اسکے کہ وہ مسلمانوں کی تنظیم سے بیحد خائف ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جہانتک مسلمانوں کی تنظیم کا تعلق ہے انکی مخالفت میں کانگریس اور حکومت دونوں ہمنوا ہیں۔ حکومت برطانیہ خود مسلمانوں کے سیاسی اتحاد سے بیحد خائف رہتی ہے اس لیے کہ مسلمان اپنی مذہبی روایات کی بنا پر اور بیرون ہند اسلامی ممالک کے ہمنوا ہو کر ہمیشہ برٹش استعمار کی راہ میں سنگ گران ہوتے ہیں

یہی وجہ ہے کہ پنجاب میں سول نافرمانی کے موقع پر گذشتہ سال جب کہ سکھوں کو صرف تا برخاست عدالت سزائیں دی گئیں اسی جرم میں مسلمانوں کو ایک سال تک کی سزائیں دی گئیں۔ برطانیہ کی جو بیرونی پالیسی اسلامی ممالک کے ساتھ ہے وہی کانگریس کی ہے جس طرح یورپ کی بڑی سے بڑی طاقت تمام اسلامی سلطنتوں کے اتحاد (وفاق) سے لرزہ براندام ہوتی ہے اسیطرح کانگریس کی ہندو اکثریت ہندوستان سے باہر مسلمانوں کی سیاسی ترقی کو دیکھنا گوارا نہیں کرتی اس لیے کہ ان کو اس قسم کے اتحاد سے ہمیشہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ کہیں ہندوستان پھر ہاتھ سے نہ چلا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ (نیشنلزم) کی بت پرستی کی ترغیب مسلمانوں کو بھی دیتی ہے۔ بہرحال ان حالات کی بنا پر کانگریس مسلم لیگ کی موجودہ ترقی اور مسلمانوں کے سیاسی عروج کی وجہ سے خطرات محسوس کرسکتی ہے خواہ وہ کتنے ہی موہوم ہوں اور ان کانگریس زدہ مسلمان حضرات سے بھی مسلم لیگ کی مخالفت کی توقع کیجا سکتی ہے جو کانگریس کے اشاروں پر فرقہ وارانہ تنظیم کو برا سمجھتے ہیں مگر جمعیۃ العلماء کے بعض ارکان کا لیگ کی مخالفت کرنا یقیناً حیرت انگیز ہے۔ اس لیے کہ جمعیۃ العلماء کی گذشتہ تمام تاریخ اور موجودہ پالیسی مسلمانوں کی

سیاسی تنظیم کی حامی رہی ہے اور یہ تعجب اس لئے اور بھی زیادہ ہے کہ جب تک لیگ کا آئین پروگرام اور نصب العین اتنا ترقی یافتہ نہ تھا انہوں نے لیگ کی کبھی مخالفت نہ کی اور جناح کا ہمیشہ ساتھ دیا اور اب جب کہ آئین نیا تغیر رونما ہوا تو ان حضرات نے بھی کانگریس کے ہمنوا ہو کر اپنی ہی تنظیم کی مخالفت شروع کر دی اگر اس مخالفت کا سبب معلوم کیا گیا تو جواب ملا کہ "اب لیگ پر اعتماد نہیں رہا اس میں رجعت پسند طبقہ شامل ہو گیا ہے" لیکن واقعات شاہد ہیں کہ لیگ میں رجعت پسند طبقہ کی کوئی آواز باقی نہیں رہی۔ یوپی لیگ پارٹی نے اسمبلی میں انڈی پنڈنٹ پارٹی تک کو اپنے میں شامل کرنے سے انکار کر دیا تاکہ رجعت پسند طبقہ لیگ میں شامل نہ ہو۔ وہ طبقہ خود اپنی سیاسی موت مر چکا ہے۔ لیکن اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ کچھ طبقہ ابھی باقی ہے تو قابل غور بات یہ ہے کہ کیا اس طبقہ کو لیگ سے باہر بیٹھ کر ختم کیا جا سکتا ہے یا لیگ کے اندر گھس کر اپنے ہم خیال قوم پرور طبقہ کی مدد کر کے۔

خود کانگریس کی مثال لے لیجئے سنہ ۱۹۱۹ء تک یہ جماعت بالکل رجعت پسند تھی سنہ ۱۹۱۰ء میں کانگریس کا صدر ایک بڑا خطاب یافتہ شخص "سر ڈبلیو ایڈبرن" تھا سنہ ۱۹۰۶ء سے پہلے تک کانگریس کا نصب العین "آئینی ذرائع سے ہندوستان کے باشندوں کے مفاد اور فلاح کو ترقی دینا تھا" اور سنہ ۱۹۰۶ء میں "ڈومینین اسٹیٹس" قرار پایا تھا۔ آج بھی نصب العین کے لحاظ سے بقول مسٹر ایم۔ این رائے کانگریس لیگ سے بہت پیچھے ہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء تک کانگریس کے عہدہ دار بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر ممتاز رہتے تھے[ع] حتیٰ کہ سنہ ۱۹۲۰ء میں جب علی برادران نے علیگڑھ یونیورسٹی کو مجبور کیا کہ اس کے تمام عہدہ داران خطاب واپس کر دیں اور سرکاری گرانٹ سے انکار کر دے۔ اور کچھ عرصہ کے لئے

ع بدرالدین طیب جی ہائی کورٹ کے جج مقرر کئے گئے، سر ایس پی سنہا لارڈ ہو کر گورنر بنائے گئے سر سی۔ پی۔ راماسوامی جو کانگریس اور ہوم رول دونوں کے سکریٹری تھے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے خود سر سریندر ناتھ بنرجی وزیر بنگال ہوئے۔

مسلم یونیورسٹی کو بند ہونا پڑا اس وقت خاص بنارس یونیورسٹی میں مالویہ جی نے محمد علی کو یونیورسٹی میں تقریر تک نہ کرنے دی تھی یہاں تک کہ سنہ ۱۹۲۱ء میں بنارس یونیورسٹی نے جو آجکل کانگریسی یونیورسٹی کہلاتی ہے شہزادہ ویلز کو آنریری ڈگری عطا کی اور وفاداری کے مراسم ادا کئے جب کہ مسلمانوں نے ان کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ خود مہاتما گاندھی نے سنہ ۱۹۱۸ء تک جنگ عظیم میں انگریزوں کو سپاہی بھرتی کر کے بھیجے۔ لیکن ان تمام رجعت پسند پالیسی کے باوجود انہوں نے کانگریس کو نہیں چھوڑا اور نہ کوئی "آزاد کانگریس" کے نام سے دوسری جماعت بنائی پھر بیچارے وہ کانگریسی مسلمان کیوں اتنی جلد باوجود امید افزا حالات کے مایوس ہو گئے۔ اس وقت جب کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں میں ایک حرکت اور بیداری پیدا ہو رہی ہے اور ہر مسلمان لیگ میں داخل ہونے کے لئے کوشاں ہے تو چند حضرات کا جمہور کے خلاف جانا اور موجودہ حالات میں شرکت کانگریس کی دعوت دینا مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنا ہے اور کانگریس کے ممبر میں اضافہ کرنا ہے جو لوگ اس وقت مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر آنے سے روک رہے ہیں وہی در اصل مسلمانوں اور کانگریس کے تعلقات کو زیادہ تلخ بنا رہے ہیں ورنہ ظاہر ہے اگر لیگ منظم ہو گئی اور مسلمانوں کی جماعتی پوزیشن مستحکم ہو جائے تو کانگریس کا متکبرانہ طرز عمل خود بخود ختم ہو جائے اور اسکو ان کے سیاسی وجود کو جماعتی حیثیت سے تسلیم کرنا پڑے اور دونوں جماعتوں میں بآسانی مفاہمت ہو جائے عجب نہیں سنہ ۱۹۱۶ء کی تاریخ پھر دہرا دی جائے اس وقت جو حالات رونما ہیں سنہ ۱۹۱۶ء کی حقیقت صاف نظر آ رہی ہے۔ اس لئے راستہ صرف یہی ہے کہ جمعیۃ العلما کے تمام اراکین ذاتی اختلافات اور شخصی وقار کو بالائے طاق رکھ کر مسلمانوں کو ایک سیاسی پلیٹ فارم پر جمع کرنے میں معاون ہوں اور جہاں تک ممکن ہو قوم پرور طبقے کو لیگ میں شامل کریں۔ اب خداوندان لیگ پر اعتماد یا عدم اعتماد کے ووٹ پاس کرنا چھوڑیں اور اس جماعت کے آئین سے فائدہ اٹھا کر اسکے نصب العین اور پروگرام کو بہتر سے بہتر صورت میں عملی جامہ پہنانے میں خود کوشاں ہوں اس کے علاوہ جو صورت بھی ہو گی وہ مسلمانوں کے لئے مہلک اور تباہ کن ہو گی اور مجموعی طور سے ملک کو بھی سخت نقصان پہنچیگا۔ اس لئے

کر متحدہ محاذ اور بین الملی مفاہمت کے بغیر آزادی ہند کی منزل برابر دور ہوتی چلی جائے گی اور کوئی اتحاد اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک مسلمان بھی سیاسی حیثیت سے خود منظم نہ ہوں۔

مسلمانانِ ہند کیلئے آخری لمحۂ فکر

کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

ہمارے سامنے تمام واقعات موجود ہیں۔ ایک طرف کانگریس کا بیحد جکبرانہ طرز عمل اور ہندوانہ ذہنیت کی کھلم کھلا نمائش ہے۔ دوسری طرف ہمارے اندر بیحد افتراق اور انتشار رونما ہے۔ ہمارے عوام صحیح رہنمائی کی تلاش میں بے چین ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے رہنماؤں کو ابھی لڑنے سے فرصت نہیں ہے۔ شعر

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

کانگریس اس مغربی اصول سیاست "لڑاؤ اور حکومت کرو" پر پوری طرح عامل ہے۔ اسکی پوری اسکیم مسلمانوں میں اور مسلم علماء اور لیڈروں میں انتشار پھیلانے میں کامیاب ہو چکی ہے۔ ایسی صورت میں ہمارے سامنے تین راستے ہیں۔ پہلا راستہ بہت آسان ہے یعنی یہ کہ ہم جمود و تعطل کا شکار بنے رہیں۔ آگے قدم نہ بڑھائیں اپنے رہنماؤں کی لڑائی دیکھتے رہیں اور اس کے منتظر رہیں کہ شاید ان میں آپس میں صلح ہو جائے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اب زمانہ نہیں رہا کہ ہم آرام سے بیٹھ کر کسی نئی چیز کا انتظار کر سکیں۔ ہم تقریباً سو برس سے رہنما پرستی میں مصروف ہیں لیکن جو قدم بھی اٹھاتے ہیں وہ پیچھے پڑتا ہے۔ زوال خلافت کے بعد سے آج تک ہمارے رہنما خود بھی ایک پلیٹ فارم پر جمع نہیں ہو سکے۔ سیاست کا تو کیا کہنا ہے۔ مذہبی معاملات میں علماء کا افتراق روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ تو ایسی صورت میں خود ہمارا فرض ہے کہ ہم ہندوستان کے صحیح حالات پر غور کریں ع

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

صورت حالات تمام ہمارے روبرو ہیں۔ ہم خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر آگے

بڑھیں۔ ہم علماء کی جنگ کے فیصلہ کا انتظار کیے بغیر میدان عمل میں نکلیں اور اپنے آپ کو ایک رشتۂ الفت میں منسلک کر کے سرگرم عمل ہو جاویں۔ شعر

کر رنگ ناداں طواف شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

ہمارے سامنے دوسرے دو راستے رہ جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم اپنی علیحدہ جماعت کو ختم کر دیں اور کانگریس میں شرکت کریں۔ لیکن ہم خوب دیکھ چکے ہیں کہ موجودہ حالات میں جب کہ مسلمانوں کا انتشار ناگفتہ بہ حالت تک پہنچ چکا ہے اور دوسری جماعت پوری طرح منظم ہے اور اسکا طرز عمل سخت مغرور اور متعصب ہے تو ہم اپنی جماعت کو نہیں توڑ سکتے ہم کو جو کام کرنا ہے مسلمان ہو کر کرنا ہے۔ ہم مسلمان پہلے ہیں اور ہندوستانی بعد میں ہیں۔ ہندوستان کی سیاست سے ہم لاپرواہ نہیں ہیں۔ مگر اس سے زیادہ مقدم ہمارا مسلمان رہنا ہے۔ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ دوسری جماعت کی فوج منظم ہے اور ہم اپنی فوج کو منظم کرنے کی کوشش میں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اگر ہماری فوج بھی اسی طرح منظم ہو گئی تو دونوں فوجوں میں جو کچھ فرق نہ رہے گا اور دونوں متحدہ محاذ قائم کر کے تیسری پارٹی سے نبرد آزما ہو سکیں گی۔ لیکن اگر ہماری فوج کے سپاہی ہماری اجازت کے بغیر انفرادی طور سے دوسری فوج میں شامل ہوتے رہیں جیسا آج ہو رہا ہے تو ظاہر ہے کہ ہماری فوج کبھی منظم نہیں ہو سکتی اور دوسری پارٹی کی طاقت برابر بڑھتی رہے گی۔ اور اس کے علاوہ پھر کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوگا جس کے خطرناک نتائج ہماری فوج کے سپاہی بعد کو محسوس کریں گے اور کوئی طاقت ان کے پاس ان کی مدافعت کی نہ ہوگی۔

آخری اور لازمی صورت

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو

وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

بے خبر تو جوہر آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

ہمارے سامنے صرف آخری صورت ایک ہے کہ ہم خود منظم ہو جائیں اب تو ضرورت اس کی ہے کہ جب یورپ کی تمام طاقتیں ایک طرف ہمارے مٹانے میں مصروف کار ہیں اور کامیاب ہو رہی ہیں اور دوسری طرف کانگریس نے مسلم کلچر اور تہذیب کو فنا کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے تو ضروری ہے کہ مسلمان متحد ہو جائیں آج تو وہ دن ہے کہ اگر غفلتوں اور بے سود فضول جھگڑوں میں یہی حال رہا تو قریب ہے کہ ہماری عزت و حیات کی آخری متاع مرقد مطہرہ رسول اللہ کی طرف بھی ان کی توپوں کے دہانے اسی طرح کھول دئے جائیں جس طرح بیت المقدس اور نہر سویز کے ساحلوں پر یورپ کے آہن پوش ڈریڈناٹ لنگر انداز نظر آ رہے ہیں۔ اس لئے ضرورت صرف اتحاد اور اتفاق کی ہے بقول شعر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے
نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاک کاشغر

مجھے اگر حیرت ہے تو یہ ہے کہ ہمارے علماء مسلمانوں کی تنظیم کرنا ممکن سمجھتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ بے بسی اور بے کسی کی حالت میں اگر کانگریس میں شرکت کرنی پڑتی ہے ہمیں بتایا جاتا ہے کہ بیس سال سے آج تک مسلمانوں کی تنظیم نہیں ہو سکی۔ تو اس پر کیوں وقت ضائع کیا جائے غضب یہ ہے کہ ایک طرف ان کے بظاہر یہ ارادے ہیں کہ کانگریس پر قبضہ کر لیا جائے جو بالکل ناممکن اور محض تسلی بخش خیال ہے، دوسری طرف وہ خالص مسلمانوں کی تنظیم سے گھبراتے ہیں اور لیگ سے ڈرتے ہیں کہ اس میں سرکاری مسلمان ہیں گو خود داخل ہو کر آزاد پسند طبقہ کو گھسانا نہیں چاہتے اب جبکہ اس کا آئین اسقدر جمہوری ہو گیا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ وہ لیگ پر قبضہ نہ کر سکیں۔ ایک طرف ہم کو یہ بھی بتلایا جاتا ہے کہ اگر ہم اپنی تنظیم میں ہی مصروف رہیں تو ملک ہم سے آگے نکل جاوے گا۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ اب ملک میں کون سی آزادی کی جنگ ہو رہی ہے اب جب کہ کانگریس اور حکومت آپس میں ساز کر کے آئین کے چلانے میں لگے ہوئے ہیں مسلمانوں کے لئے بہترین موقع ہے کہ وہ اپنی گذشتہ تاریخ کی تلافی کرنے میں مصروف ہو جائیں۔ بہت جلد وہ زمانہ آ جائے گا کہ اگر مسلمان ایک رشتہ میں منسلک ہو گئے تو کانگریس خود ان کے قدموں پر گرے گی کانگریس آٹھ کروڑ ہندوستانیوں کے بغیر ایک قدم آگے نہیں

بڑھا سکتی جب تک مسلمان منتشر ہیں اور کانگریس کی دورُخی سیاست کا شکار ہیں ہندوستان اور مقامات مقدسہ کی آزادی بدستور دور ہے مسلمان صرف بیس سال کا پروگرام بنالیں اور یورپ کے استعمار اور کانگریس کی ہندوانہ اور جابرانہ ذہنیت کو بتلا دیں کہ مسلمان مذہب کے نام پر ہمیشہ ایک ہلالی نشان کے سایہ میں جمع ہو سکتے ہیں پھر دیکھئے جلد ملک دیکھ لے گا کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا اور دونوں طاقتیں متحد نظر آئیں گی۔ یہ توہین آمیز طرز عمل تو صرف اس لئے ہے کہ ایک قوم طاقتور ہے اور ایک بہت کمزور ہے، طاقتور قوم کمزور سے صلح کیا معنی گفتگو تک گوارا نہیں کیا کرتی۔ تاریخ شاہد ہے کہ وہی ترکی جو جنگ عظیم کے بعد یورپ کا مرد بیمار کہا جاتا تھا اب وہ لائق فرزند کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ایک عرصہ تک دنیا کی سیاست سے علیحدہ رہے اور خود اپنی تنظیم میں مصروف رہے۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے بقول شعر

رشتۂ الفت میں جب ان کو پرو سکتا تھا تو
پھر پریشان کیوں تری تسبیح کے دانے رہے

ہمارے لئے یورپ کی خطرناک سیاست اور برادران وطن کا طرز عمل "تازیانۂ قدرت" کا کام کر رہے ہیں ہمیں ایک طرف ہندوستان کی آزادی کا خیال ہے۔ دوسری طرف بیت المقدس کی مصیبت ہم کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ تیسری طرف برطانوی تجارتی چالیں حجاز میں مصروف کار نظر آ رہی ہیں اور اٹلی اور جرمنی کی "اسلام نوازی" پالیسی مشرقی اسلام پر نظر جمائے ہوئے ہے۔ پھر کہاں ہیں وہ حضرات جو کانگریس میں لے جانے کے اس قدر دلدادہ ہیں۔ مگر مسلمانوں کے انتشار کو دور کرنے اور ان کی تنظیم کرنے کے لئے ان کے پاس ایک لمحہ بھی نہیں ہے۔ کہاں ہیں وہ آنکھیں جن کو درد ملت میں خونباری کا دعویٰ کہاں ہیں وہ دل جن کو زوال ملت کے زخموں پر ناز ہے اور کہاں ہیں وہ رہنما جو خلافت کے زمانے میں از فرق تا قدم "سراپا حکم ربانی" بن کر کہتے تھے کہ یقین کی لازوال طاقت ہمارے ساتھ ہے اور صد افسوس کہاں ہیں وہ بزرگان ملت اور اس برباد شدہ قافلہ کے نارسا جن کی قو

ہے آخری لمحے جلد جلد گزر رہے ہیں اور وہ بےخبر ہیں یہ کیا غضب ہے کہ ہمارے گھر میں آگ
کے شعلے بلند ہیں اور ہمارے رہنما ہماری نجات اس میں سمجھتے ہیں کہ اس آگ سے نکال کر ہم کو
ایک تباہ کن کنوئیں میں پھینک دیں جہاں سے سلامت نکلنا ہمارے لئے ناممکن ہوگا۔
ہماری تنظیم ہمارا اتحاد اور ہمارا اتفاق کسی کے لئے جنگ کا الٹی میٹم نہیں بلکہ عین پیام
امن ہے ہمارا واحد مقصد ہندو مسلم قوتوں میں اتحاد پیدا کرنا ہے۔ ہم مصالحت اور آزادی کے
لئے تنظیم کرنا چاہتے ہیں۔ ابھی ہندو آزادی کے لئے نہیں بیشک اہل سے ہم ہمیشہ کرتے رہیں گے
اور فتح ہماری ہی ہوگی۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم دوسروں پر اعتماد کرنا چھوڑ دیں خود میدان
جنگ میں نکل کھڑے ہوں موسم گذر رہا ہے۔ آسمان ہمیشہ مہربان نہیں ہوتا اور وقت جاکر
پھر واپس نہیں آتا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسلامی ہند میں ایک عام حرکت بیداری پیدا ہوگئی
ہے اور موجودہ مصائب نے ہمارے دلوں پر جو اضطراب طاری کر دیا ہے وہ ایک آخری
فرصت عمل ہے جس سے اگر کوئی صحیح کام نہ لیا گیا تو پھر ہمیشہ حسرت ماتم کے سوا اور کچھ نہ ہوگا
اس لئے اب ضرورت ہے کہ اس منتشر قوم کی شیرازہ بندی اور تنظیم کے لئے ہم میں سے
ہر شخص اپنے آپ کو وقف کر دے اور اپنے واحد سیاسی ادارہ مسلم لیگ کو منظم اور مستحکم بنانے
میں ہر ممکن کوشش عمل میں لاوے ہندوستان کا ہر بالغ مسلمان مسلم لیگ کا باقاعدہ ممبر بن
جائے اور ملک میں مسلمانوں کی جو آواز ہو وہ اسی پلیٹ فارم سے نکلے پس وقت آگیا
ہے جس کو اٹھنا ہے اٹھے جس کو چلنا ہے چلے کیونکہ ساعت آخری، تاریخ سامنے
مہلت قلیل۔ اور فرصت مفقود ہے۔ شعر

مژدہ اے پیمانہ بردار خمستان حجاز
بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش

عبدالوحید خاں

اعلان

ان تمام حضرات سے جو مسلمانوں کی تنظیم کے خواہاں اور لیگ کے کام کے متمنی ہیں
گذارش ہے کہ درمے قدمے سخنے اس کتاب کی اشاعت میں معاون ہوں گے تاکہ ہر مسلمان
کانگریس کے موجودہ فریب سے بچ جائے گا۔ ہو جائے اہل دل حضرات سے امید ہے کہ وہ حتی المقدور
زیادہ سے زیادہ تعداد میں ان کتابوں کو خرید کر عوام میں مفت تقسیم کریں،
ممبران محمدن لیگ سے درخواست ہے کہ وہ اس کتاب کو خود بھی
پڑھیں اور دوسروں کو بھی سنا دیں۔
مسلم لیگ کمیٹیاں یا تو اپنے فنڈ سے خرید کر اپنے اپنے حلقوں میں مفت تقسیم کریں یا کم از کم
سو کاپیاں ایک ساتھ خرید کر اپنے زیر نگرانی فروخت کریں اور اسی طرح اشاعت کرتے رہیں
لیگ کمیٹیاں اپنے اپنے حلقوں کی ہر مسجد میں ایک ایک کتاب رکھدیں اور
امام صاحب سے درخواست کریں کہ مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً پڑھ کر سنائیں
نوٹ:۔ یوپی کے ہر ضلع مسلم لیگ کے دفتر اور یوپی سے باہر ہر
پراونشل لیگ کے دفتر سے یہ کتاب دستیاب ہو سکتی ہے

ملنے کا پتہ:۔
عبدالوحید خاں ۔ ۹ لاٹوش روڈ لکھنؤ